بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سب سے پہلے پاکستان

اقوامِ عالم کے پیشِ نظر ''وطن'' سے بلند کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہی ان کی امیدوں کا مرکز اور ان کی تمناؤں کا محور ہوتا ہے۔ اسی کی خاطر وہ جیتے اور اسی کی خاطر مرتے ہیں۔ اسی کے نام پر وہ قوم کے جذبات کو مشتعل کرتے اور اسی کے تحفظ کے لئے وہ ان سے قربانیاں مانگتے ہیں۔ موجودہ مغربی سیاست نے ''وطن'' کو ایک دیوتا کی حیثیت دے رکھی ہے جس کی پرستش قوم کا ہر فرد کرتا ہے۔ یہ اس لئے کہ مادی نظریۂ حیات کی رو سے طبیعی وجود (Physical Existence) سے بلند کوئی مقصد ہی نہیں' اور چونکہ اس کے لئے ''وطن'' ناگزیر ہے' اس لئے ان کے نزدیک' وطن ہی زندگی کا منتہائے مقصود ہے۔

لیکن اسلام کے نزدیک' وطن کی دو حیثیتیں ہیں۔ اس کی ایک حیثیت تو اس خطۂ زمین کی ہے جس کے استحکام کے ساتھ' اس خطۂ زمین کے اندر رہنے والوں کی جان' مال۔۔عزت' ناموس کی حفاظت وابستہ ہے۔ اس کی یہ حیثیت ایک صندوق کی سی ہے جس کے اندر آپ نے اپنی قیمتی اشیاء رکھی ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان قیمتی اشیاء کی حفاظت کے لئے' صندوق کی ضرورت بھی ہے اور اس کا مضبوط ہونا بھی از بس ناگزیر ہے۔ ایسا انتظام بھی ضروری ہے جس کی رو سے یہ صندوق ہر دراز دست کی دستبرد سے محفوظ رہے۔

اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ ہمارے دین کے تقاضوں کے پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دین نام ہے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اور یہ ظاہر ہے کہ ان قوانین کے مطابق زندگی' ایک آزاد خطۂ زمین ہی میں بسر کی جا سکتی ہے۔

وطن کی پہلی حیثیت وہ ہے' جس میں' ایک مسلمان اور دنیا کی دیگر اقوام میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (اگرچہ اس حیثیت میں بھی' مسلمان' ایک دیوتا کی طرح وطن کی پرستش نہیں کرتا۔ اسے خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے) لیکن وطن کی دوسری حیثیت وہ ہے جس میں مسلمان' منفرد ہے' وطن کی پہلی حیثیت' محض آدمی کی سطح کا تقاضا ہے۔۔اور یہ ظاہر ہے کہ ہر

انسان' آدمی بھی ہوتا ہے۔لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر آدمی انسان بھی ہو۔قرآن کی رو سے' انسانیت کی زندگی مومن ہی کے حصے میں آتی ہے۔ غیر مسلم جب وطن کی حفاظت چاہتا ہے تو اس سے وطن کی پہلی حیثیت کا تحفظ مقصود ہوتا ہے۔لیکن جب مسلمان' وطن کی حفاظت کا متمنی ہوتا ہے تو اس سے' وطن کی دونوں حیثیتوں کا تحفظ مقصود ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ابھار کر سامنے لانے کے لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم اپنے وطن کی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم بنائے رکھو **ترھبون به عدو الله وعدو کم** (۸/۶۰)۔تاکہ اس سے ان لوگوں کے دل پر خوف طاری رہے جو''تمہارے بھی دشمن ہیں اور خدا کے بھی دشمن''۔''تمہارے دشمن''۔ سے وطن کی پہلی حیثیت سامنے آتی ہے' اور''خدا کے دشمن'' سے دوسری حیثیت۔مسلمان کے نزدیک' یہ دونوں حیثیتیں' ایک دوسرے سے الگ نہیں کی جاسکتیں۔اس لئے کہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

جام کی گردش کے لئے ساقی کا رہنا ضروری ہے۔اور ساقی' اس وقت تک ساقی ہے جب تک جام موجود ہے' پاکستان کے حصول میں اس کی یہ دونوں حیثیتیں سامنے تھیں اور اب اس کی حفاظت اور استحکام کے لئے بھی اس کی یہ دونوں حیثیتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔

لیکن ہم نے دیکھا یہ ہے کہ کچھ عرصہ سے یہاں پاکستان کے تحفظ و استحکام کے لئے جس قدر آوازیں بلند ہو رہی ہیں ان میں' پاکستان کی پہلی حیثیت زیادہ نمایاں ہے۔۔۔حکومت وقت نے''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگایا اور مقررین کی تقریروں میں' ریڈیو' ٹی وی کے ترانوں میں۔''وطن'' کا نام بار بار آیا' لیکن قرآن کا نام بہت کم آیا۔۔مثلاً

وطن ہے ہمارا وطن کے ہیں ہم
یہی دھن ہے جب تک کہ ہے دم میں دم
وطن کی محبت میں دل شاد ہے
غلامی کی بندش سے آزاد ہے
اے وطن۔ میرے وطن۔ پیارے وطن
کس قدر شاداب ہیں تیرے چمن
میں اپنے وطن کا سپاہی بنوں گا.....
تم اپنے وطن کی حفاظت کرو۔۔۔اپنے ملک کو بچاؤ وغیرہ

اگر ہم صرف ''وطن'' تک محدود رہیں گے اور قرآن کا نام نہ لیں گے' تو ہم میں اور دوسری قوموں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔۔اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ آپ پاکستان کے ریڈیو اور ٹی وی سے مندرجہ بالا نغمے اور ترانے سننے کے بعد جب جالندھر ریڈیو بھارتی ٹی وی کے چینل پر جائیں گے تو بعینہٖ یہی الفاظ آپ کو وہاں سے سنائی دیں گے۔حتیٰ کہ جب آپ نے اپنے ہاں کے ان سپاہیوں کو جنہوں نے 1965ء کے معرکہ میں جان دے دی' شہید وطن کہہ کر پکارا' تو ہندوؤں نے اپنے وطن کی حفاظت کے لئے جان دینے والے نائیک عبدالحمید' کو شہید وطن قرار دے کر' ملک کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا۔ یاد رہے کہ قتال فی سبیل اللہ ہو یا قتال فی سبیل الطاغوت' وطن کی حفاظت و استحکام کا جذبہ دونوں میں مشترک ہوتا ہے۔لیکن جو چیز قتال فی سبیل اللہ کو قتال فی سبیل الطاغوت سے متمیز کرتی ہے' وہ یہ جذبہ ہے کہ وطن کی حفاظت اس لئے ضروری ہے کہ یہ ہماری جان' مال' عزت' آبرو کا محافظ اور ہماری اجتماعی قوت کا مرکز ہے اور ہماری جان' مال' عزت' اور قوت کا تحفظ ضروری ہے تاکہ یہ مستقل اقدار خداوندی کی حفاظت اور تنفیذ کا ذریعہ بنیں۔**قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العٰلمین** (۶/۱۶۲) یہ ہے مسلمان کا صحیح نعرہ اور یہی نعرہ ہمیں بلند کرنا چاہئے۔

ہم عمائدینِ حکومت و سیاست سے گذارش کریں گے کہ وہ اپنی تقریروں' خطبوں' گفتگوؤں اور مذاکروں میں اس بنیادی نکتہ کو پیش نظر رکھیں اور وطن کی جگہ قرآن کی حفاظت' قوم کا مقصود و منتہیٰ قرار دیں اور وطن کا تصور اس حیثیت سے پیش کریں کہ یہ قرآنی نظام کی آماجگاہ بننے کے لئے وجود میں لایا گیا ہے اور اسی لئے اس کی حفاظت ضروری ہے۔اس (بظاہر) ذرا سی تبدیلی سے' ہماری تمام کوششوں اور قربانیوں کے قبلہ نما کا رخ' جانب قبلہ ہو جائے گا۔**و فیھا کتب قیمۃ۔**

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم المقام جناب میر ظفر اللہ خان جمالی صاحب وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

عنوان : بزرگ افراد معاشرہ کے تجربات اور حقوق

☆ جناب من! میں سب سے پہلے آپ کو پاکستان کا وزیر اعظم منتخب ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت و برکات کا نزول فرمائے۔ آمین۔

☆ میں اپنی 70 ویں سالگرہ پر بزرگ افراد معاشرہ کی طرف سے حاصل شدہ حمایت کے ساتھ چند گذارشات پیش خدمت کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ ان میں کچھ تجربات کی مہک اور بزرگ افراد معاشرہ کے چند حقوق کا تذکرہ ہے۔

☆ اگر کسی نظریہ میں قدامت اور بقا کا رنگ بھی موجود ہو تو وہ گویا زمانے کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور بقا حاصل کر گیا۔ ایسا نظریہ حکمت سے زیر استعمال لانا چاہیئے۔ علمی تاریخ میں یہ مرتبہ ''**قرآن کریم**'' کو حاصل ہے۔ یہ آخری کتاب عزت مآب خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ آج یہ پوری نوع انسانی کی کتاب ہدایت ہے۔ آج دنیا میں **220** زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان تمام زبان والوں تک قرآن کریم کا پیغام پہنچانا ملتِ اسلامیہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ اس آفاقی ولافانی کتاب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ عربی دان' قانون دان' سائنسدان' ماہرین معاشیات و معاشرت کا **P.H.D** گروپ اس پر کام کرے اور سٹیٹ فلاسفی سے اس کے نفاذ کی سفارشات کرے کیونکہ اسلام میں پرائیویٹائزیشن کا کوئی مقام نہیں۔ قرآنی اقدار حیات میں **ولقد کرمنا بنی اٰدم (17/70)** کو حقوق و احترام انسانی میں خشتِ اول کی حیثیت حاصل ہے۔ ع آدمیت احترام آدمی: باخبر شو از مقامِ آدمی (اقبال)۔

اگر آپ کے دور میں اس کام کی ابتدا ہو گئی تو تاریخ پاکستان میں آپ کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ اس سے ہندومت کی موت اور اسلام کا احیاء ہوگا۔ (انشاء اللہ)

☆ میں اپنی **70** ویں سالگرہ پر **15** سالہ قرآنک ریسرچ کا ماحصل ''**عزۃ القرآن**'' کی صورت میں انشاء اللہ جلد سامنے لا رہا ہوں۔ آپ کی خدمت میں بھی پیش کروں گا۔

☆ اب بزرگ افراد معاشرہ کے حقوق کی بات ہو جائے۔ **(1)** قیام پاکستان میں ان کی خدمات اور قربانیاں تقاضا کرتی ہیں کہ مختلف فورم میں ان کو اعزازی نمائندگی دی جائے تا کہ وہ اپنے تجربات سے آگاہ کر سکیں۔ **(2)** بڑھاپا پینشن **-/1500** روپے ماہوار تک بڑھا دی جائے۔ **(3)** غیر پنشنرز کو گذارہ الاؤنس دیا جائے۔ **(4)** زرد **(Yellow)** رنگ کا شناختی کارڈ جاری کیا جائے جو ان کی بزرگی کا بااعتماد ترجمان ہو۔ **(5)** سفر میں نشست گاہ الاٹ ہو۔ **(6)** لائبریریوں میں اعزازی ممبرشپ دی جائے۔ **(7)** عمرہ میں رعایت دی جائے۔ **(8)** دیہاتی بوڑھوں پر خصوصی نظر کرم فرمائی جائے۔

☆ باغبان ایسوسی ایشن سبز انقلاب کی داعی ہے۔ بنجر پاکستان کو بہر حال سبز بنانے کا پروگرام منظور کیا جائے۔ اگر وقت ملے تو میرا باغیچہ دیکھ لیں یا رپورٹ منگوا لیں۔ والسلام۔

ملک حنیف وجدانی' صدر باغبان ایسوسی ایشن' معرفت PO موہڑہ سیداں' مری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات القرآن

ن س خ

نسخ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری چیز کو لے آنا۔ دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا (ابن فارس)۔ **نسخت الشمس الظل۔** آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اس کی جگہ روشنی لے آیا۔ یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا۔ **نسخت الریح آثار الدیار۔** ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات وعلامات) کو تبدیل کر دیا (یعنی وہ کھنڈرات وغیرہ جن سے آبادی کا پتہ نشان ملتا تھا انہیں ریت سے ڈھانک کر دگرگوں کر دیا)۔ **نسخ الکتاب۔** ایک کتاب کو نقل کر کے اس جیسی دوسری کتاب مرتب کر لینا۔ اسی سے **النسخۃ** منقول (Copied) کتاب کو کہتے ہیں (تاج۔ محیط و راغب)۔ قرآن کریم میں ہے **انا کنا نستنسخ** (۴۵/۲۹)۔ ''ہم لکھوا لیتے تھے''۔ مٹا دینے یا زائل کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۲/۵۲) میں آیا ہے۔ **فینسخ اللہ** ''اللہ مٹا دیتا ہے''۔

لہٰذا **نسخ** کے بنیادی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا۔ اس لفظ کی اہمیت اس لئے ہے کہ ہمارے ہاں ناسخ و منسوخ کا عقیدہ چلا آ رہا ہے اور اسے دین کے مہمات میں سے سمجھا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم۔ اس لئے کہ اس کا غلط مفہوم دین کو اس کی جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے اور اس کا صحیح مفہوم قرآن کو خدا کے دین کا آخری اور واحد ضابطہ ثابت کر دیتا ہے۔

ناسخ و منسوخ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں (بعض کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سو تک ہے) جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ پھر سن لیجئے کہ (اس عقیدہ کے مطابق) قرآن کریم میں پانچ سو کے قریب ایسی آیات ہیں جنہیں محض ''ثواب'' کی غرض سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں جو احکام ہیں وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض احکام قرآن کریم کی دوسری آیات نے منسوخ کر دیئے ہیں اور بعض احکام احادیث نے منسوخ کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے (مثلاً آیۂ رجم۔ یعنی زانی کو سنگسار کرنے کے حکم والی آیت)۔ اس عقیدہ کی رو سے قرآن

کریم کی شکل یوں بنتی ہے کہ:

(۱) قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام تو منسوخ ہو چکے ہیں لیکن جن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے۔اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر تو نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ دوسری قسم کی آیات کے لئے تو دلیل صرف روایات کی ہے۔لیکن پہلی قسم کی آیات کے لئے خود قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے دلیل لائی جاتی ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے۔

ما ننسخ من آیة او ننسھانات بخیر منھا او مثلھا۔ الم تعلم ان اللہ علی کل شیئ قدیر (۲/۱۰۶)۔

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

> ہم جس آیت کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ اس لئے قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی اسی طرح سے موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے۔ یہ تعین بعد میں روایات کی رو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رو سے کیا گیا۔ چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک ان کی تعداد صرف پانچ ہے۔

باقی رہا ''فراموش کرا دینے'' کا سوال۔ سو اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتی تھیں لیکن رسولؐ اللہ (معاذ اللہ) انہیں بھول جاتے تھے۔ تو پھر انہی جیسی آیات اور نازل ہو جاتی تھیں۔ یہ مراد ہے **او ننسھا** سے۔ اس کی دلیل میں یہ آیۃ پیش کی جاتی ہے۔ **سنقرئک فلا تنسیٰ الا ماشاء اللہ.....** (۸۷/۶۔۷) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا' ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے۔

اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئے کہ خدا' قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لئے وہ قرآن کریم کے اس حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔

قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی ناسخ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ

دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی اس کی ناسخ۔

اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ تصور کہ حضورؐ خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے۔ یاللعجب!

ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم آگے آئے گا۔ **سنقرئک فلا تنسیٰ** کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ن۔س۔ی دیکھئے جہاں اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔

اب دیکھئے اس آیت (**ما ننسخ**.....) کا صحیح مفہوم۔ پیچھے سے سلسلۂ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن کریم اور رسالت محمدیہؐ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآن کریم ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے)۔ اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا (اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا) کہ جب خدا نے انبیاء سابقین (مثلاً حضرت موسےٰ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل کر دیئے تھے، اور وہ احکام توریت وغیرہ میں موجود ہیں۔ تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی ضرورت کیا تھی؟ اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت حضرت نوحؑ کے زمانے سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو وحی بھیجی جاتی تھی ان میں ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہوتا تھا جو وقتی ہوتے تھے اور ان کا تعلق خاص اسی قوم سے ہوتا تھا جس کی طرف وہ احکام بھیجے جاتے تھے اور انہیں انہی حالات میں نافذ العمل رہنا ہوتا تھا جو اس زمانے کے تقاضے سے پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں، جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضوں سے وہ حالات بدل جاتے تو ایک اور رسول آ جاتا اور وہ ان احکام کی جگہ دوسرے احکام لے آتا۔ اس طرح یہ جدید وحی اس سابقہ وحی کی قائم مقام (ناسخ) بن جاتی۔ یہ سلسلہ شروع ہی سے ایسا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ توریت کے کتنے احکام ہیں جنہیں حضرت عیسےٰؑ نے آ کر بدل دیا (یہ بدلے ہوئے احکام انجیل میں موجود ہیں)۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اس کی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دیئے جاتے تھے۔ ان کی سطح سے بلند احکام و قوانین روک لئے جاتے تھے۔ تا آنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی۔ تو وہ ''روکے ہوئے'' احکام و قوانین اس وقت نازل کر دیئے جاتے۔ تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کارفرما رہا ہے۔

نیز یہ شکل بھی ہوتی کہ ایک رسول کے چلے جانے کے بعد، اسکی قوم اس کی وحی کے بعض حصوں کو ترک کر دیتی۔ بعض کو فراموش کر دیتی۔ اس لئے ان ترک کردہ یا فراموش کردہ حصوں کو (جن میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی) بعد میں آنے والے رسول کی وحی سے ازسرنو تازہ کر دیا جاتا۔

یہود سے کہا گیا کہ وحی کا سلسلہ اس طرح چلا آ رہا ہے۔ اب وہ دور آ گیا ہے جس میں انسانی شعور پختگی حاصل کر لے گا۔ لہٰذا اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ۔

(۱) سابق انبیاء کی وحی کے وہ تمام احکام جو ان کی قوم کے حالات اور ان کے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ مخصوص تھے منسوخ کر کے ان کی جگہ' دوسرے احکام و قوانین بھیج دیئے جائیں اور چونکہ وحی کا یہ سلسلہ اب ختم ہو رہا ہے اس لئے یہ احکام وقتی اور ہنگامی نہیں ہوں گے بلکہ ابدی طور پر انسانیت کا ساتھ دینے والے ہوں گے۔ اس لئے یہ احکام و قوانین سابقہ احکام سے بہتر ہوں گے۔

(۲) وہ قوانین جنہیں پہلے روک لیا گیا تھا کیونکہ ہنوز انسانیت اس سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ انہیں سمجھ سکے یا اپنا سکے' اب انہیں بھی نازل کر دیا جاتا ہے' کیونکہ قرآن کریم انسانیت کی بلند ترین سطح تک اس کا ساتھ دے گا۔

(۳) اور سابق انبیاء کی وحی کے وہ احکام و قوانین جنہیں ان کی قوموں نے ترک کر دیا تھا۔ یا فراموش کر دیا تھا (یا جن میں انہوں نے تحریف کر دی تھی) ان کی تجدید کر دی گئی ہے (ان کی مثل احکام دے دیئے گئے ہیں)۔

یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے ایک نئے رسول اور نئی کتاب کو بھیجا گیا ہے اور یہ ہے وہ وجہ کہ اب تمام سابقہ کتابوں کی جگہ اسی قرآن کریم پر ایمان لانا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اب اس کے سوا ہدایت کی کوئی اور راہ نہیں۔ **فان امنوا بمثل ما امنتم به فقد اهتدوا و ان تولوا فانما هم فی شقاق** (۲/۱۳۷)۔ اگر یہ بھی اسی طریق پر ایمان لائیں جس طرح (اے جماعت مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ ہدایت پا سکیں گے اور اگر اس راہ سے اعراض برتیں گے تو پھر خدا کے راستے کے مخالف سمت جائیں گے۔

یہ ہے صحیح مفہوم **ما ننسخ من آية او ننسها نات بخير منها او مثلها** کا۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کس طرح اس مفہوم کے آئینہ دار بنتے ہیں۔

نسخ کے معنی ہم نے اوپر دیکھ ہی لئے ہیں۔ کسی چیز کی جگہ کسی دوسری چیز کو لے آنا۔ آیت کے معنی صرف قرآن کریم کی آیات نہیں۔ قرآن کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیات اللہ کہا ہے۔ مثلاً اسی سورۃ بقرہ میں قصۂ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا۔ **فاما يا تينكم منى هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون** (۲/۳۸)۔ جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کرے گا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا اور اس سے آگے ہے۔ **و الذين كفروا او كذبوا بايتنا** ..... (۲/۳۹) ان کے برعکس' جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کریں گے اور ان سے انکار کریں گے..... یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی ہے اسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا **ما ننسخ من آية** میں آیات سے مراد قرآن کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کسی سابق وحی کی آیات کی تبدیلی بعد کی وحی کی آیات

سے۔جیسا کہ سورۃ نحل میں کہا گیا ہے۔**و اذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ**۔(۱۶/۱۰۱)۔''اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں''۔

اس کے بعد لفظ **ننسھا** ہے۔یہ لفظ **نسی** سے ہے۔**نسی** کے معنی کسی چیز کو ترک کر دینا' یا فراموش کر دینا' آتے ہیں۔(دیکھئے عنوان ن۔س۔ی)۔اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آجاتی ہے کہ سابقہ کتب آسمانی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں۔چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا۔لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو ازسرنو محکم کر دیتا (۲۲/۵۲)۔یا وہ اس وحی کے کچھ حصے کو ترک ہی کر دیتے تھے۔اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں پھر شامل کر دیتا۔اس سے بھی ظاہر ہے کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت (یا اس کی مثل اس جیسی آیت) سے مراد سابق وحی کی آیات ہیں نہ کہ قرآن کریم کی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت۔

نسی کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہ چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔اس اعتبار سے آیت **ننسھا** سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے' انہیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے۔

اس اعتبار سے قرآن کریم ایک طرف تمام انبیاء سابقہ کی وحی کا مھیمن ہے (۵/۴۸)۔یعنی اس کے اندر وہ تمام قوانین محفوظ ہو گئے ہیں اور دوسری طرف خدا کو جس قدر احکام نوع انسانی کے لئے دینے تھے' ان سب کی تکمیل ہوگئی ہے۔**و تمت کلمت ربک صدقا و عدلا** (۶/۱۱۶)۔نہ خدا کی طرف سے اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی ہے اور نہ انسانوں میں سے کوئی اس میں ردوبدل کر سکے گا۔کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (۱۵/۹)۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے وحی کے سلسلہ کو اس طرح کیوں رکھا۔تو اسکا جواب یہ کہہ کر دے دیا کہ **ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر** (۲/۱۰۶)۔خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں۔وہ جانتا ہے کہ انسانوں کو کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دور کب آئے گا جب انہیں مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جائے۔یہ سب کچھ ان اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر اسے پوری پوری مقدرت حاصل ہے۔

یہ ہے ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم۔جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے۔البتہ ہر حکم خاص حالات کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے۔جب حالات بدل جائیں تو اس کی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔مثلاً صلوٰۃ کے لئے وضو کا حکم ہے۔لیکن اگر پانی نہ ملے یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمّم کا حکم ہے (۵/۶)۔ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمّم کا حکم آگے آجائے گا۔جب پانی

مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا) تو پھر وضو کا حکم آ گے آ جائے گا اور تیمّم کا حکم پیچھے چلا جائے گا۔

یا مثلاً قرآن کریم نے چور اور زانی (وغیرہ) کے لئے سزا مقرر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں چوری اور زنا کی وارداتیں نہ ہوں تو قرآن کریم کے (سزاؤں کے متعلق) احکام نافذ العمل نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کسی معاشرہ میں مفلس، محتاج، گدا گر نہ رہیں تو خیرات وغیرہ سے متعلق احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو وراثت کے احکام اس پر نافذ نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے جس میں فالتو دولت یا جائداد کسی کے پاس نہ ہو تو وراثت کے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کو ''ناسخ و منسوخ'' سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ احکام اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ جب وہ حالات پھر پیدا ہو جائیں جن کے ماتحت انہیں نافذ ہونا تھا، تو وہ پھر نافذ ہو جاتے ہیں۔ ''منسوخ'' اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہو سکے۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی حکم نہیں۔

ماننسخ والی آیت (۲/۱۰۶)۔ یا سورۃ النحل کی آیت **اذا بدلنا آیة مکان آیة** (۱۶/۱۰۱) میں اگر آیۃ سے مراد کائناتی حوادث و وقائع لئے جائیں (جنہیں قرآن کریم متعدد مقامات پر ''آیات اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے) تو ''نسخ آیت'' سے مراد ہو گا نظام کائنات کے کسی ایک طریق یا مظہر کی جگہ کسی دوسرے طریق یا مظہر کا آ جانا۔ ارباب علم و تحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ کائنات میں اس قسم کے تبدلات کس طرح آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن چونکہ ہر دو مذکورہ بالا آیات کے سیاق و سباق کا تعلق وحی سے ہے اس لئے ہم پہلے بیان کردہ مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ دوسرے مفہوم کی رو سے معانی میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اول الذکر مفہوم ہو یا ثانی الذکر، یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو۔ اس غیر متبدل صحیفۂ آسمانی کا ایک ایک حرف اپنے مقام پر اٹل ہے اور اٹل رہے گا۔ **واللہ علیٰ ما نقول شھید۔**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موریس بوکائے

مترجم سید امتیاز احمد

ظہورِ آدم

بائبل، قرآن اور جدید سائنس کی روشنی میں

زیرِ نظر مضمون معروف کتاب بائبل، قرآن اور سائنس کے مصنف، موریس بوکائے کی ایک اور کتاب What is the origin of man? کے تعارف کے ترجمہ پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں مصنف موصوف نے تخلیق آدم کے موضوع پر بائبل، قرآن اور سائنس کی روشنی میں زیادہ مفصل اور مدلل تجزیاتی مطالعہ کے بعد جہاں دینِ خالص اور سائنس کی ہم آہنگی کا اصول اخذ کیا ہے وہاں قرآن کی حقانیت پر بھی سائنسی نقطۂ نگاہ سے مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ ویسے تو پوری کتاب لائقِ مطالعہ ہے سردست اس کا تعارف قارئینِ طلوعِ اسلام کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

انسان ہزاروں برس سے اپنی ابتدا کے بارے میں غور و فکر کرتا چلا آ رہا ہے۔ مگر کچھ عرصہ قبل تک اس کے خیالات کا منبع یا تو مذہبی تعلیمات تھیں یا مختلف فلسفیانہ مکاتب فکر۔ دورِ جدید میں آ کر جب انسان کو نئی معلومات حاصل ہوئیں تو اس نے اپنی ابتداء کے مسئلے کے بارے میں نئے زاویے سے سوچا۔

ہم ایک ایسے دور میں زندہ ہیں جہاں عقل اور سائنسی علم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذہن انسانی کے تمام بڑے سوالات کا منطقی جواب تلاش کر لیا گیا ہے۔ انسان کی ابتداء بھی ایک ایسا ہی سوال تھا جس کے بارے میں کہا گیا کہ اس کی مکمل وضاحت انسانی علم کر سکتا ہے۔ انواع کی ابتداء پر، ڈارون کی کتاب 1859ء میں انگلینڈ میں منظرِ عام پر آئی جسے عوام میں پذیرائی حاصل ہوئی اور آنے والے برسوں نے دیکھا کہ ایک ایسے نظریئے کے اثرات کتنے اہم تھے جو تخلیق آدم کے بارے میں محض چند امکانات ہی پیش کرتا تھا۔ دراصل مذہبی تعلیمات کے بارے میں پہلے ہی ایک معاندانہ فضا موجود تھی اس فضا کے زیرِ اثر ڈارون کے نظریے کو ایک ثابت شدہ حقیقت کے طور پر قبول کیا گیا اور اس کی رائے کو عین منطقی سمجھتے ہوئے لوگوں نے فرض کر لیا کہ انسان بندر کی ارتقاء یافتہ شکل ہے۔

بلکہ کچھ لوگ تو ڈارون سے بھی آگے گئے اور معلوم سے نامعلوم کا قیاس کرتے ہوئے کہا گیا کہ جیسے دیگر

انواع ماضی میں موجود مختلف انواع سے وجود میں آئیں' اسی طرح انسان بھی حیوانی حیات کی کسی نوع کے ارتقاء کے نتیجے میں زمین پر نمودار ہوا۔

یہ بیان ان تمام لوگوں کے لئے شدید دھچکے کا باعث بنا جو بائبل کی تعلیمات پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ انسان خدا کی تخلیق ہے۔ اسی طرح ارتقاء کا نظریہ بھی بائبل سے متصادم تھا جو کہتی ہے کہ انواع طے شدہ اور غیر متبدل ہیں۔

سائنسی نظریات اور مذہبی تعلیمات باہم متصادم تھے اور اس تصادم کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ کہا گیا کہ بائبل جسے اس وقت تک کلام خداوندی سمجھا جاتا تھا' غلط ثابت ہو چکی ہے اور اس کی تعلیمات پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سوں کے لئے تو اس کا مطلب بائبل کے پورے متن کا انکار تھا۔ نتیجتاً یہ سمجھا گیا کہ سائنسی معلومات ''خدا پر ایمان'' کو ختم کر دیتی ہیں۔

بظاہر بات منطقی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس دلیل میں آج کوئی وزن نہیں کیونکہ بائبل کے متن کے بارے میں جو حقائق آج ہمارے سامنے ہیں انیسویں صدی کے آخر میں وہ ابھی دریافت ہو رہے تھے۔ آج بائبل کے منزل من اللہ ہونے کے بجائے یہ نظریہ فروغ پا چکا ہے کہ یہ ایک ایسا وجدانی متن ہے جو مختلف اوقات میں عام انسانوں نے لکھا۔ نتیجتاً یہ متن اپنے زمانے کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا اور اس دور کے اساطیر' روایات اور اوہام اس میں راہ پا گئے۔ کہا گیا ''بائبل میں موجود سائنسی اغلاط درحقیقت انسانی غلطیاں ہیں کیونکہ اس دور کے انسان کی ذہنی سطح ابھی بچگانہ تھی اور وہ سائنس سے بیگانہ تھا۔'' یہ اقتباس ایک بڑے عیسائی مفکر John Guitton کا ہے جس کا زاویہ نگاہ بائبل کے بارے میں اس نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے جس سے کسی دور میں اسے دیکھا جاتا تھا۔ جس متن کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کے بارے میں مسلسل یہی خیال کیا جاتا رہا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی تصنیف ہے۔ جبکہ درحقیقت کتاب پیدائش کے قدسیانہ (Sacerdotal) متن کا بیشتر حصہ چھٹی صدی قبل مسیح کے علماء کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اسرائیلی متن نویں یا دسویں صدی قبل مسیح تک پرانا ہو سکتا ہے۔ (اس موضوع پر تفصیلی گفتگو میں ''بائبل قرآن اور سائنس'' 1 میں کر چکا ہوں) اگر اس کے ساتھ بائبل کی مسیحی تاویلات کو بھی ذہن میں رکھا جائے تو ہم اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ سائنس اور بائبل کے متصادم ہونے اور اس تصادم میں سائنس کی برتری اور بائبل کی ناکامی کی بحث کو طول دینا قطعاً لایعنی ہے۔

جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے دیگر کتابیں اپنی ابتداء اور متن کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں مگر وہاں بھی سائنس اور مذہب کے متخالف ہونے کا نظریہ قطعاً بلا جواز ہے۔

حقیقت بہرحال یہی ہے کہ سائنسدان ہر اس نظریے کو ناپسند یا کم از کم نظر انداز کر دیتے ہیں جو انہیں بالائے فطرت نظر آئے۔ یہ رویہ پچھلے کچھ عرصے میں خاصا جڑ پکڑ چکا ہے کہ سائنس ہر مسئلے کا حل ہے اور جلد یا بدیر' یہ ایسے انکشافات میں کامیاب ہو جائے گی جو زندگی کی ابتداء' حیات کی تخلیق اور بقا' اور زمین پر موجود سادہ ترین حیات

سے لے کر پیچیدہ ترین انواع کے بارے میں ہمیں درست معلومات فراہم کریں گے۔ اور بالآخر انسان کی ابتداء کے بارے میں بھی۔ اس صورت حال میں یقیناً یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا سائنسی ترقی مذہبی تعلیمات سے آگے نہیں نکل چکی۔

آخر ہم کس طرح ان تمام انکشافات سے متاثر نہ ہوں؟ جو جدید سائنس، خصوصاً مالیکیولی حیاتیات اور جینیات کے شعبوں میں کر چکی ہے۔ جبکہ یہ انکشافات حیرت انگیز طور پر ہمیں خلیاتی افعال تک کے بارے میں علم عطا کر چکے ہوں؟

محققین کا جوش وخروش قابل فہم ہے۔ وہ تحقیق اور عمل کے وسیع تر امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے مستقبل کے انسان تک کے بارے میں منصوبے بنا رہے ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ اس کے کچھ خواص اور صلاحیتیں متعین کی جا سکتی ہیں۔ اس بات کو نظری طور پر قابل عمل سمجھا جا رہا ہے۔

علم جینیات کے عملی امکانات پر تحقیق کرنے والے سائنسدان یقیناً اس بات سے پریشان بھی ہوتے ہیں کہ اگر یہ تمام امکانات قابل عمل ہو گئے تو اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ مگر پھر بھی ایسی طاقت کا تصور، اگرچہ یہ طاقت ابھی محض تصوراتی ہے، انہیں پرجوش کرنے کے لئے کافی ہے۔

بہت سے سائنسدانوں کے خیال میں یہ امکانات اگر انہیں وہاں تک لے جائیں جہاں وہ حیاتیاتی مادے کی خصوصیات اپنی مرضی سے تبدیل کر سکیں، (جو کہ ایسی کوششوں کا منطقی انجام ہے) تو یہ بات حیات کی ابتداء کے متعلق کسی بھی الہیاتی تصور کو ختم کر دینے کے مترادف ہوگی۔

یہی بات ان کے متعلق بھی درست ہے جنہیں یقین ہے کہ ابتدائی حیاتیاتی مادہ جلد یا بدیر تجربہ گاہ میں تخلیق کیا جا سکے گا۔ اگرچہ یہ بات یقیناً ان کے حق میں جاتی ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں ہمیں بہت سی قیمتی معلومات فراہم کر چکے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ محض اپنی تجربہ گاہوں میں تحقیق کر کے انسان کی ابتداء کے بارے میں کوئی یقینی اور ثابت شدہ معلومات فراہم کر سکیں گے تو صریحاً غلطی پر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی ابتداء اور ارتقاء کا معاملہ انتہائی پیچیدہ ہے۔ اس کا تعلق اتنے بہت سے علوم سے ہے کہ کسی ایک انسان کے متعلق تو یہ تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ وہ بے شمار دستیاب معلومات، مفروضات اور پیش کردہ امکانات کا تفصیلی مطالعہ تک کر سکے گا۔

ان حالات میں ہم اس بات پر یقین نہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ کسی ایک شعبے میں کی گئی تحقیق ہمیں زیر بحث سوال کا کوئی قابل تشفی جواب فراہم کر سکے گی۔ لہٰذا مفروضات پر قائم ایسے کسی نظریے کو قبول کر کے ہم زیر بحث موضوع کے متعلق اپنے دستیاب علم کو بھی نقصان ہی پہنچائیں گے اور کچھ محققین تو ایسے بھی ہیں جو ان نظریات کے تحفظ میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں جن کا درحقیقت سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔

P.P. Grasse جو سوربون یونیورسٹی میں 30 برس تک ارتقائی حیاتیات کے شعبے کے کرسی نشین رہے، اپنی نئی کتاب Man Stands Accused میں اسی بات پر زور دیتے ہیں اور آج کل کی Neo Darvinism کے پیش کردہ نظریات پر شدید تنقید کرتے ہیں۔ علم الحیوانات

کے اس ممتاز عالم کا حوالہ میں اپنی کتاب میں کئی جگہ دوں گا کیونکہ میرے خیال میں اس کے پیش کردہ نظریات درست ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ارتقاء کا نظریہ درست ہونے کے باوجود اس بارے میں ہمارے علم میں کئی خلا موجود ہیں۔ ہمیں ان عوامل کا بھی درست علم نہیں جو اس کا تعین کرتے ہیں۔کبھی کبھار ہونے والی جینیاتی تبدیلیاں ارتقاء کے لئے قطعاً ناکافی ہیں۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ Australopithecus سے لے کر اب تک یعنی تقریباً 80 ہزار پُشتوں سے گزر کر انسانی دماغ میں واقع ہونے والی تبدیلیاں Neo-Darvinism کی اصطلاحوں میں قطعاً ناقابل فہم ہیں۔

انسانی ارتقاء کے بہت سے پیچیدہ سوالوں میں سے ایک تو یہی ہے کہ اس کے طبعی یا فطری خواص کہاں گئے؟ جب کہ بندروں میں وہ خواص اسی طرح موجود رہے ہیں۔ انسانی ارتقاء اور حیوانی ارتقاء ایک جیسے ہرگز نہیں ہیں۔ پھر بھی ہمیں مسلسل ایسی نامکمل معلومات فراہم کی جارہی ہیں جو ڈارونی نظریے کی حمایت کرتی ہیں۔

کچھ عرصہ قبل مجھے ایک ریڈیائی پروگرام سننے کا اتفاق ہوا۔ جس میں ایک اہم تحقیقاتی ادارے کے ایک سائنسدان سے انٹرویو کیا جارہا تھا۔ یہ پروگرام لاکھوں لوگوں نے سنا ہوگا اور سائنسدان موصوف فرمارہے تھے کہ انسان اور بندر کا تعلق' دونوں کے جین تجربہ گاہ میں اکٹھے کر کے' ثابت کیا جاچکا ہے۔اور اس طرح مالیکیولی سطح پر ایک نیا کیمیائی مادہ تخلیق کیا جاچکا ہے۔

بات درست ہوگی مگر اس سے ہمیں پتہ کیا چلتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

مغالطہ یہ پیدا کیا جارہا ہے کہ سمجھا جائے کہ یہ جین ایک نئی نسل کی ابتداء کرسکتا ہے جبکہ درحقیقت ایسی کوئی بات ثابت نہیں کی گئی۔

افسوس یہ ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں جب عوام کو متاثر کرنے والے سنسنی خیز نظریات بہت سی غلطیوں کے ساتھ پیش کیے جارہے ہیں بجائے اس کے کہ انتہائی احتیاط اور تحقیق کے بعد تحفظات رکھتے ہوئے درست نظریات پیش کیے جائیں جو نامعلوم حقائق کی جانب ہماری رہنمائی کرسکیں۔

شائد اس مرحلے پر کہا جائے کہ ہمیں گفتگو محدود رکھنی چاہئے اور انسان کی ابتداء کے مسئلے پر سائنسدانوں کے پیش کردہ مفروضات اور حقائق کی تائید یا تردید کرنی چاہئے۔ آخر صحائفِ مقدسہ کو اس معاملے میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟

پہلے ہم ان لوگوں کی بات کرتے ہیں جو سائنسی حقائق اور مذہبی عقائد کو الگ الگ رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد گزشتہ کچھ دہائیوں سے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ایک غیر مذہبی شخص کے لئے کسی معاملے میں مابعد الطبیعیات کا تذکرہ محض خطائے تاریخی ہے۔ چاہے وہ مسئلہ خود اس کے لئے ایک معمہ ہی کیوں نہ ہو مثلاً Genetic Codes کسی ایسے سوال کا مابعد الطبیعیاتی جواب اس کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا۔ اگرچہ اس کے پاس کوئی متبادل جواب بھی نہیں۔ یہ رویہ ہماری مجموعی جدید فکر کا لازمہ ہے۔

مذہب اور سائنس کی تفریق کا ایک نظریہ اس کے بالعکس بھی ہے۔ یعنی تفریق کرنے والا ایک مذہبی انسان بھی ہوسکتا ہے جسے یہ خوف لاحق ہے کہ سائنس اس کے مذہبی عقائد کی تردید کرسکتی ہے چنانچہ وہ ایسے کسی تقابل سے باز رہتا ہے جس کے بارے میں اسے بتایا گیا ہو کہ ایسا کرنا ''خطرناک'' ہوسکتا ہے۔

اس صورت حال کی دیگر وجوہات بھی ہوسکتی ہیں مثلاً تفہیم کی کمی۔ ایسا عام طور پر وہاں ہوتا ہے جہاں عقائد مختلف ہوں۔ لوگوں کو دیگر مذاہب کے بارے میں علم نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے (بلکہ بعض اوقات خود اپنے صحائف کے بارے میں بھی)۔

ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ توحیدی مذاہب یعنی تاریخی ترتیب سے یہودیت' عیسائیت اور اسلام آج ایک تہائی سے زیادہ انسانی آبادی کے عقائد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان مذاہب کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ مذاہب انسان کی ابتداء کے مسئلے پر کیا کہتے ہیں۔ انسان کی ابتدا کے بارے میں ان مذاہب کے صحائف مقدسہ کے بیانات زیادہ دلچسپ اس وجہ سے بھی ہوگئے ہیں کہ خود ان صحائف کی ابتدا کے بارے میں ہم آج بہتر علم رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ایسے نظریات وخیالات سامنے آسکتے ہیں جو اکثر لوگوں کے لئے نئے ہوں گے۔

بائبل کا معاملہ تو یہ ہے کہ آج جب ہمیں بائبل کے مؤلفین کے بارے میں بہتر معلومات حاصل ہیں۔ بہت سے پرانے نظریات متروک ہو چکے ہیں اور اس کے متن میں موجود بشری عنصر کو نظرانداز نہیں کیا جاتا۔ ایک متن جو نسبتاً چھوٹا ہے' زیادہ پرانا ہے اور اس سے ہمیں پتہ چل سکتا ہے کہ نوویں اور دسویں قبل مسیح کے لوگ انسان کی ابتداء کے بارے میں کس طرح سوچتے تھے۔ بات کتاب پیدائش کے اسرائیلی یا یہودائی متن کی ہورہی ہے۔ جو متن زیادہ معروف ہے' چھٹی صدی قبل مسیح کے علماء کا تالیف کردہ ہے۔ کتاب پیدائش کے پہلے حصہ میں تخلیق کا نظریہ پیش کیا گیا جو ایک روایت کا پیش خیمہ تھا' اسی روایت کو بعد میں عیسائیت نے قبول کرلیا اور نئے عہد نامہ میں زمین پر انسان کی موجودگی کا عرصہ بھی متعین کیا گیا۔ صدیوں تک بائبل کے نظریات بلا ردوکد قبول کیے جاتے رہے۔

مجھے یاد ہے 1930ء میں میں نے مذہبی ہدایات کی ایک کتاب دیکھی جس میں زمین پر انسان کے نمودار ہونے کو تقریباً چار ہزار برس قبل کا واقعہ بتایا گیا تھا۔ یہی تعلیم ہمارے دور میں تمام نوجوان عیسائیوں میں ملتی تھی۔

عیسائی ممالک میں ایک عرصے تک قرآن کے متعلق غلط فہمی پر مبنی آراء موجود رہی ہیں۔ بلکہ جہاں تک قرآن کے مشمولات اور اس کی تاریخ کا تعلق ہے اب بھی موجود ہے۔ لہٰذا مسئلہ زیر بحث پر قرآن کا موقف جاننے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ قرآن انسان تک کیسے پہنچا۔ تخلیق آدم پر قرآن میں موجود بیانات بہت سے لوگوں کے لئے حیرت کا باعث ہوں گے جیسے وہ میرے لئے استعجاب کا باعث تھے جب وہ پہلی دفعہ میرے سامنے آئے۔

اس موضوع پر قرآن اور بائبل کے بیانات کا تقابل بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ دونوں خدا کو خالق قرار

دیتے ہیں مگر بائبل کی غیر سائنسی تفصیلات قرآن میں موجود نہیں۔ قرآن میں موجود بیانات حیرت انگیز ہیں جن کا اس دور کے علم انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی انسان کے علم میں ہونا ناممکن ہے۔

یہ بیانات مغرب میں 9 نومبر 1976ء تک کبھی زیر بحث نہیں آئے تھے۔ (جب میں نے قرآن میں موجود علم جنین اور افعال الاعضاء سے متعلق معلومات اپنے ایک مقالے میں فرانس کی نیشنل اکیڈیمی آف میڈیسن میں پیش کیں۔) یہ معلومات اپنے دور سے کوئی چودہ صدیاں آگے کی تھیں۔ قرآن کے دیگر مظاہر فطرت پر بیانات کے ساتھ انسان کی ابتداء کے بارے میں قرآنی نظریہ' مذہب اور سائنس کے قدیم مباحثے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

قرآنی بیانات نئے دلائل کے ساتھ بحث کا دوبارہ آغاز کرتے ہیں۔ ثابت شدہ سائنسی حقائق اور صحیفہ مقدسہ کے اتفاق کو دیکھتے ہوئے ہمیں جلد بازی میں ایسے فیصلے نہیں کرنے چاہئیں جو حقائق سے زیادہ محض اندازوں پر منحصر ہوتے ہیں۔

انیسویں صدی کے بعد سے مغرب میں سائنس اور مذہب باہم متخالف ہیں۔ جس کا سبب سائنسی حقائق اور بائبل کے بیانات کا اختلاف ہے۔ حالانکہ بائبل کے متن میں انسانی عنصر ثابت ہو چکنے کے بعد اس اختلاف کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

یہ بات ذہن میں رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ خود مسیحی تفسیر و تاویل بھی بائبل کو ''خدا سے ہدایت یافتہ'' انسانوں ہی کی تحریر قرار دیتی ہے۔ لہٰذا ان میں غلطیوں کے در آنے کا امکان موجود رہتا ہے۔ یہ غلطیاں محض زبان کی تبدیلی سے بھی واقع ہوسکتی ہیں اور اپنے دور کے روایتی علوم کا نتیجہ بھی۔ اس صورت حال میں کوئی سائنسی غلطی حیرت کا باعث نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ منطقی نقطۂ نگاہ سے کسی غلطی کا نہ ہونا حیرت کا باعث ہوتا۔

بائبل کے جدید مفسرین تمام ثابت شدہ سائنسی حقائق سے متفق ہیں۔ وہ سائنس اور بائبل کے متن میں موجود اختلاف کو تسلیم کرتے ہیں۔ دوسری ویٹیکن کونسل (1962--1965ء) کی جاری کردہ دستاویز کے مطابق بائبل کے متن میں ایسا مواد موجود ہے جو ''ناقص اور متروک'' ہے۔ اگرچہ اس مواد کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہیں سے اس کتاب میں پیش کردہ نظریے کی صداقت بھی ثابت ہوتی ہے۔

میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہودیوں کے اعلیٰ علمی حلقوں میں بھی ایسے نظریات موجود ہیں۔ میں یہاں چند سال پہلے کی ایک گفتگو کا حوالہ دوں گا جو میرے اور یہودی دنیا کی ایک اہم شخصیت کے مابین ہوئی۔ موضوعِ گفتگو قدسیانہ متن میں پیدائش کا بیان تھا۔ ہم نے اس بات پر اتفاق کیا کہ متن میں موجود سائنسی اغلاط کا سبب چھٹی صدی عیسوی کے مذہبی علماء کا رویہ تھا۔ جن کی واحد کوشش یہ ہوتی تھی کہ خدا کے ہر شے پر قادر ہونے کا یقین لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے کائنات کی تخلیق کی ایک ایسی داستان سنائی جو اس دور کے انسان کے لیے آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہو۔ عبرانی کیلینڈر کے مطابق زمین پر انسان کے نمودار ہونے کے عرصے کو بھی

اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ بائبل کا یہ بیان کہ انسان آج سے 5,742 سال پہلے تخلیق ہوا۔ یقیناً سائنسی حقائق کے صریحاً خلاف ہے۔مگر جب ہم ایسے دلائل سے دوچار ہوتے ہیں جن کے مطابق اس بیان کوحرف بہ حرف تسلیم کرنا ضروری نہیں تو ہمارے لیے یہ بھی ممکن نہیں رہتا کہ مذہب اور سائنس کے اختلاف میں اس بیان کو مذہب کے خلاف دلیل کےطور پر استعمال کریں۔یعنی انسانی عنصر کو مدنظر رکھنا لازم ہے۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے کتاب پیدائش اور جدید سائنس کے اختلاف کو اوپر بیان کردہ حقائق کی روشنی ہی میں دیکھا جانا چاہئے۔ ہم اگر اس بات کو قبول کر لیں تو مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔اورانسان کی ابتداء جیسے اور مسائل میں بھی جہاں جدید سائنس اور بائبل کے موقف مختلف ہیں، تفہیم کی صورت نکل سکتی ہے۔

اگرچہ مابعد الطبیعیاتی عنصر کا ان معاملات میں یوں داخل کیا جانا بظاہر عجیب محسوس ہوتا ہے لیکن اس کی معقولیت اور مفید ہونے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس طرح ہم لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھارنے کی کوشش بھی نہیں کرتے جس کا الزام مذہبی حلقوں پر مادہ پرست مفکرین کی جانب سے عائد کیا جاتا ہے۔

لامتناہی طور پر عظیم اور لامتناہی طور پر حقیر اشیا پر منطقی غور وفکر کے نتیجے میں خدا کا تصور کیوں نہ پیدا ہو جبکہ غیر جانبدار ہو کر دیکھا جائے تو دونوں میں ایک سا نظم و ضبط موجود ہے۔

جہاں تک اس کتاب What is the origin of man? کے موضوع کا تعلق ہے ہم دیکھیں گے کہ حیاتیاتی مادے کی پیدائش اور نشوونما بھی ایک ضابطے اور ترتیب کی پابند ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدا اپنی ہستی کا اظہار سائنس کے تقاضوں کے مطابق نہیں کرتا مگر یہ ضرور ممکن ہے کہ سائنسی اصولوں کی مدد سے اس کی ہستی کا عرفان حاصل کیا جا سکے۔

میرا طریقہ کار سراسر استدلالی اور معقول رہا ہے۔ میں نے سائنسی نتائج فکر کو تسلیم کیا ہے (بشرطیکہ وہ ثابت شدہ حقائق ہوں نہ کہ محض قیاس آرائیاں) اور اس کے باوجود مجھے سائنسی حقائق اور مذہبی عقائد کے مابین کوئی تناقض محسوس نہیں ہوا۔ گو اس کے ساتھ ہمیں مذہبی صحائف کی نوعیت اور ان کی تاریخ کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ہم سے غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم انسانی عنصر کی وجہ سے موجود غلطی کی گنجائش کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ غلطیاں معلومات کی کمی کے سبب سرزد ہوئی ہوں گی۔

اس کتاب What is the origin of man? کی تحریر کا سبب یہی ہے کہ مذہبی عقائد اور سائنسی معلومات کے مابین تقابل کر کے ان نکات کی وضاحت کی جائے جنہیں عام طور پر مبہم چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ فریقین کے بیانات پر گفتگو کے بعد ماضی کے بغض وعناد کا خاتمہ ممکن ہو سکے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

جبر و اختیار

زندگی بلاشبہ سب سے مشکل سوال ہے اور یہ طے ہے کہ مشکل سوالات کے جوابات مباحث اور مناظروں سے کہیں باہر موجود ہوتے ہیں۔ بحثوں کا بجز اس کے کوئی مصرف نہیں کہ ان کے بغیر جنگ و جدال کو طول نہیں دیا جا سکتا۔ پس اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ناممکن ہے جو مسئلہ نہ ہو مسئلہ بنا لیا گیا ہو' جیسے ہمارے ہاں ''جبر و اختیار'' کو مسئلہ بنا لیا گیا ہے اور مدت مدید سے علمی جنگوں میں بطور کمک استعمال ہوتا آ رہا ہے۔ فلسفیانہ باریکیوں' پیچیدہ لفظیات' منطقیانہ موشگافیوں اور ادق اصطلاحات کی زرہیں پہنے' ڈھالیں سجائے' تلواریں سونتے' نیزے تانے.....! کبھی ان آلات حرب کے بغیر بھی کسی نے اسے جاننے بلکہ محسوس کرنے کی کوشش کی ہے؟ شاید بہت کم' بہت ہی کم' حالانکہ اس مسئلے کے تعین سے زندگی کی راہیں متعین ہونے میں بے حد مدد مل سکتی تھی۔ ان گنت دشواریاں آسانیوں میں بدل سکتی تھیں لیکن ہمیں مشکلات اور کٹھنائیاں جمع کرنے کا اچیچا شوق لاحق ہے' ایک مریضانہ مشغلہ میں ہم زمانوں سے مبتلا چلے آ رہے ہیں۔ کبھی ہم نے یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ اس شغل اعظم کے ساتھ چند ہستیوں اور انجمنوں کا رزق وابستہ ہے! قربان جائیں چھپانے والے نے کہاں کہاں رزق کے ذرات چھپا دیئے ہیں۔

'جبر و اختیار' کیا گھڑا ہوا مسئلہ ہے یا نہیں؟ سیدھی سی بات ہے جس کا یہ مسئلہ نہیں اسے خواہ مخواہ اس میں کود کر اسے گھڑنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے' لیکن ہماری اکثریت وفور اشتیاق سے زقند بھر کے اس میدان میں کود تی ہے اور پھر اپنے علمی کمالات کا خوب خوب مظاہرہ کرتی ہے' واقعی شوق دا کوئی مل نہیں ہوندا۔ وگرنہ مچھلی سے تو آج تلک کسی نے نہیں پوچھا بی تیرنا تیرا مسئلہ ہے کہ نہیں؟ جگنو سے تو کبھی کسی نے دریافت نہیں کیا میاں! چمکنا آپ کا پرابلم ہے یا نہیں؟ بعینہ حضرت انسان بھی آغاز سے جس جس جبر میں اسیر رہا ہے' بہرحال رہا ہے' جس جس اختیار کو انجوائے کرتا آیا ہے' بہرصورت کرتا آیا ہے۔ جبر و اختیار کی صورتیں شروع سے ایسے ہی چلی آ رہی ہیں' جیسی اب لمحہ موجود ہیں وہ Exist کر رہی ہیں۔ مثلاً زمانہ قدیم کا انسان بھی یہ اختیار رکھتا تھا کہ وہ جب چاہتا اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا' اسے تب بھی یہ مکمل اختیار تھا کہ حفظان صحت کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی کے دورانیہ کو طویل کر سکتا تھا۔ آج بھی صورتحال یہی ہے' آج بھی انسان یہ اختیار حاصل نہیں کر سکا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے' ہزاروں سال پہلے کے انسان کے پاس بھی ایسا خوش کن اختیار نہیں تھا۔ جب انسان غاروں میں رہتا تھا تب بھی اس کے اپنے اعمال ہی نتائج

مرتب کرتے تھے' آج کا جدید انسان بھی اپنے ہی اعمال و افعال کی نتائج آفرینی کے عمل میں گرفتار ہے۔ خوراک' پانی' آکسیجن کی پرانے انسان کو بھی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی عہد حاضر کے انسان کو ہے۔ موجودات میں رزق کے اسباب سینکڑوں برس قبل بھی ایسے ہی بکھرے ہوئے تھے جیسے آج ہیں' تب بھی یہ تقسیم انسانوں کے ہاتھ میں تھی آج بھی انسان ہی اپنے ہاتھوں سے رزق دوسرے انسانوں میں بانٹتا ہے۔ صحیح تقسیم پر پہلے بھی قوموں کی زندگی خوشگوار ہوا کرتی تھی آج بھی اگر ایسا ہو تو لازماً زمین بہشت بریں کی نظیر دکھائی دے گی۔ دوسرے کے حق پر غاصبانہ قبضہ سے تب بھی فرد کی ذات سیاہی مائل ہوتی تھی' آج بھی یہی عمل دہرانے سے لازماً ذات کی نشوونما متاثر ہو گی۔ فرد کی برداشت کے تناسب سے زہر کی مقدار تب بھی ایسی ہی ہلاکت آفریں ثابت ہوتی تھی جیسے آج ہوتی ہے۔ پہلے بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پھانسی کی سزا پانے والے کی گردن میں رسی بندھی ہوئی ہو اور وہ جھول رہا ہو پھر جب اسے اتارا گیا ہو اور وہ زندہ سلامت ہو' اس تجربے کو دہرانے سے آج بھی لاش ہی وصول کرنی پڑے گی' جیتا جاگتا انسان نہیں۔ وہ قومیں جنہوں نے ماضی میں دوسری قوموں کی زندگی اجیرن کر دی بالآخر وہی ایذا رسانی خود ان کے اپنے لئے عذاب بن کر نازل ہو کے رہی۔ ہدایت یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے والے افراد زندگی کی مسرتوں سے بہرہ یاب تب بھی ہوتے تھے' آج بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ خالق کائنات اپنے طے شدہ قوانین میں پہلے بھی ترمیم نہیں کرتا تھا آج بھی وہ کسی کو رعایتی نمبر دینے کو تیار نہیں۔ سوال اس کی قدرت کا نہیں' قانون قدرت کا ہے۔ بس اس نے یہ کہہ دیا کہ حضرت محمد ﷺ آخری نبی ہیں' اب وہ آخری ہی رہیں گے' چاہے کوئی کچھ کر لے' اس کے حکم میں کسی نوع کی کوئی ترمیم ممکن نہیں۔ جن رشتوں کی تحریم آ گئی ہے وہ ایسی ہی رہے گی کبھی تحلیل میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ یہی اس کے قانون کی اٹل تعریف ہے۔ ہماری دانست میں یہ بحث بالکل غیر ضروری ہے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے یا نہیں کر سکتا۔ نہیں وہ ویسا کبھی نہیں کرے گا کیونکہ اس نے کہہ دیا ہے کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ اگر اس نے یہ اصول بنا دیا ہے کہ انسان خیر و شر کے انتخاب میں کامل آزاد ہے تو وہ یہ آزادی کبھی سلب نہیں کرے گا' ہاں مزید یہ کہ اس نے خیر کے اختیار کی صورت میں جو نتائج رکھ دیئے ہیں وہ وہی رہیں گے' بالکل اسی طرح جو اسنے شر کے سلسلہ میں رکھ دیئے ہیں۔ اب آگے انسان کی اپنی مرضی ہے' خالص اس کی اپنی مرضی کیوں کہ اس احسن الخالقین کی یہ سنت کبھی تبدیل نہیں ہو گی جو ازل سے جاری ہے کہ ہر فرد کو اپنے اعمال کے حوالے سے خود جوابدہ ہونا ہو گا' حساب دینا ہو گا اور ظاہر ہے حساب وہ اسی صورت میں دے گا جب ہدایت و گمراہی کے باب میں اس نے انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice) کے حق کو ہر مداخلت سے بالا ہو کر استعمال کیا ہو گا۔ صاحبو! آخر میں ہمیں بس اتنا عرض کرنا ہے کہ قومی سطح پر ہم سے غالباً غیر شعوری طور پر ایک گناہ کبیرہ سرزد ہو رہا ہے کہ ہم اپنے افعال کو اپنے رب سے منسوب کر رہے ہیں۔ خدا کے لئے اپنے اعمال کا کسی اور کو ذمہ دار بھلے قرار دے لیجئے مگر اس خدا کے سر نہ تھوپیں جو سب سے منزہ ہستی ہے' سب سے پاکیزہ ہستی ہے!

(بشکریہ روزنامہ ''دن'' لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشاهده و مطالعه

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

ہمارے زوال کے اسباب

زندگی میں بہت کچھ پڑھا ہے، پڑھنے لکھنے کے سوا کیا بھی کیا ہے؟ لیکن قرآن پاک کے بعد جس کتاب کو پڑھ کر میں بے حد خوفزدہ ہوا ہوں، وہ میاں محمد افضل کی کتاب ہے: ''سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک''۔ میں نے اسے دو ایک سال پہلے بھی پڑھا تھا اور اب ایک بار پھر اس کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں مصنف نے مختلف ادوار میں بغداد، غرناطہ، سمرقند و بخارا، سلطنت عثمانیہ، سلطنت مغلیہ، وسط ایشیا اور مشرقی پاکستان میں ملت اسلامیہ کے زوال، ذلت و رسوائی اور تباہی و بربادی کی تفصیلات اور اسباب بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں اور چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور امیر تیمور کے بعد یورپ کی مختلف مسلم دشمن طاقتوں، روسی کمیونسٹوں اور بھارتی فوجوں کے ہاتھوں عالم اسلام کی جو درگت بنتی رہی ہے، اس کا نقشہ بڑے ہی دردناک انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ سارے ہولناک، لرزا دینے والے واقعات پڑھتے ہوئے میں اس لئے بھی خوف سے لرزتا رہا کہ وہ سارے اسباب، جن کی وجہ سے مسلمان مختلف زمانوں میں زوال کا شکار ہوئے اور بدترین تباہی و بربادی سے دوچار ہوئے، وہ اپنی پوری شان اور جزئیات کے ساتھ وطن عزیز پاکستان کی فضاؤں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

مشہور عالم دین اور تحریک آزادی کے اولین ہیرو مولانا محمود حسن (اسیر مالٹا) نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: میں نے جزیرہ مالٹا میں اسیری کے دوران راتوں کو جاگ جاگ کر غور کیا کہ مسلمان بار بار زوال کا شکار کیوں ہو جاتے ہیں؟ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے دو اسباب ہیں: قرآن سے دوری اور آپس کی نااتفاقی۔ چنانچہ زیر نظر کتاب کی تفصیلات پڑھ کر بار بار اس قول کی صداقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں اور جب بھی مسلمان نکبت و ذلت کا شکار ہوئے، وہاں سب سے بڑا سبب قرآنی تعلیمات سے انحراف اور باہمی نفاق ہی نظر آتا ہے۔ چنانچہ حکمرانوں اور امراء کی تقلید میں عوام بھی قرآن سے دور ہوئے تو عیاشی، اسراف، نمائش، ہوس زر، غیر سنجیدگی، بے حسی، دنیا پرستی، شقاوت قلبی اور ظلم و عدوان گویا ان کے شعار بن گئے اور بغداد ہو یا سپین، ترکی ہو یا وسط ایشیا، دہلی یا ڈھاکہ، جہاں بھی تباہی آئی، جہاں بھی ہم ذلت و رسوائی اور شکست فاش سے دوچار ہوئے، وہاں

بار بار ایک ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنما بار بار تکرار کے ساتھ اس بات کو دہراتے چلے جا رہے ہیں کہ عہد حاضر میں ہمارے سارے مسائل کا سبب ہمارے دشمنوں کی سازشیں ہیں۔ چنانچہ یہودیوں، ہندوؤں اور امریکہ و برطانیہ کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں پر بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں مسلمانوں کے خلاف ان اقوام کے معاندانہ عزائم کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ میرے نزدیک سوچ کا یہ انداز اس اعتبار سے بے حد خطرناک اور نقصان دہ ہے کہ اس سے امت مسلمہ مجموعی اعتبار سے اس مفروضے کی اسیر ہو گئی ہے کہ ہم تو بالکل معصوم، عن الخطاء اور بے گناہ ہیں اور سارا قصور ہمارے دشمنوں کا ہے۔ بلاشبہ دشمن سازش کرتے ہیں، انہیں اس کا حق بھی پہنچتا ہے، لیکن کاش ہم اپنے عوام کو یہ باور کرا سکتے کہ اصل روگ ہمارے اپنے اندر ہے اور بے شمار اور متنوع خرابیوں نے ہمارے اندرون کو اس طرح کھوکھلا کر دیا ہے اور ہمارا روحانی و تہذیبی نظام اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ دشمن کی سازشیں بڑی آسانی سے مطلوبہ ہدف حاصل کر لیتی ہیں۔ کاش ہم حقیقت پسندی سے اس امر کا اعتراف کر لیں کہ پاکستان کی پچپن سالہ تاریخ میں ہم نے ہر نوع کی بے مثال حماقتوں کا ارتکاب کیا ہے اور آج ہم جس المیے سے دوچار ہیں، وہ انہی حماقتوں کا نتیجہ ہے اور قرآن پاک کے بعد زیر نظر کتاب کی زندہ مثالیں اس امر کی شہادت دیتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ جب مسلمان ایمان و عمل کے اعتبار سے کھوکھلے ہو جاتے ہیں اور ان کا دینی و روحانی کردار گہنا جاتا ہے تو وہ کسی شدید ترین عذاب سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

بے حد تشویش ناک امر یہ ہے کہ پاکستان کی طرح باقی اسلامی دنیا کی صورت حال بھی کم و بیش ایسی ہی ہے۔ پورے مشرق وسطیٰ، عالم عرب اور افریقہ میں ملوکیتوں اور فوجی آمریتوں نے اس پورے خطے کو گویا قبرستان میں تبدیل کر دیا ہے اور یہ سارے ممالک علمی، فکری اور تہذیبی و سیاسی اعتبار سے بانجھ ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر عراق کے فوجی ڈکٹیٹر صدام نے گزشتہ تقریباً چالیس سال سے اپنے ملک اور عوام کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے، وہ غیر معمولی اور بڑا ہی اندوہناک ہے۔ اس سفاک آمر نے دینی طبقے کو مکمل طور پر ملیا میٹ کر دیا ہے اور اختلاف کی ہر شکل کو بے رحمی سے ختم کر دیا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک وقت میں ہزاروں کُرد مسلمانوں کو اس نے کیمیاوی اسلحے کے تجربے کی بھینٹ چڑھا دیا۔ یہ شخص اس قدر شقی اور شکی مزاج کا حامل ہے کہ اپنے سگے بہنوئی، دو دامادوں اور قریب ترین دوستوں کو بھی تہہ تیغ کرنے میں کسی دریغ سے کام نہیں لیا۔ اگر کوئی نوجوان تسلسل کے ساتھ چند روز تک مسجد میں چلا جائے، تو اسے غائب کرا دیا جاتا ہے، اس شخص کی ذاتی زندگی بڑی ہی گھناؤنی ہے اور اس کے دونوں بیٹے بھی پرلے درجے کے بدکار و بدعمل ہیں۔

عراق کی سرزمین پر یہ مردم کش خونی کھیل کم و بیش چالیس سال سے کھیلا جا رہا ہے اور عجیب بات ہے کہ پاکستان کی بعض مذہبی جماعتیں صدام کی ہمیشہ حامی رہی ہیں۔ صرف مولانا مودودی اور میاں طفیل محمد کے ادوار میں جماعت اسلامی کے جرائد و اخبارات اس کے رویوں اور

کارناموں کی نقاب کشائی کرتے رہے ہیں' لیکن ستم دیکھئے کہ ان کے جانشین نے صدام سے گہرے برادرانہ تعلقات استوار کر لئے اور جب اس نے امریکی ایجنڈے کے عین مطابق کویت پر قبضہ کرلیا تو قاضی حسین احمد نے نہ صرف اس کی برملا حمایت کی' بلکہ اس کے حق میں جلوس تک نکالے۔ اسی طرح مولانا نورانی اور مولانا فضل الرحمٰن بھی صدام کے گہرے دوست اور بہی خواہ ہیں۔ چنانچہ یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے اور تعجب بھی کہ ہمارے دینی رہنما بجا طور پر ہندوستان اور اسرائیل کے خلاف تو غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں' لیکن عراق' شام' تیونس' مصر اور لیبیا وغیرہ کے بے رحم آمروں کے معاملے میں مکمل خاموشی اختیار کئے رکھتے ہیں' بلکہ ان کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں' حالانکہ اپنے مسلمان عوام پر جس قدر مظالم صدام' حافظ الاسد' جمال ناصر اور حبیب بورقیبہ نے ڈھائے ہیں' اس کے سامنے ہندوستان اور اسرائیل کا رویہ کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

اندازہ کیجئے کہ ہندوستان اور اسرائیل میں مسلمانوں کو مذہبی آزادیاں حاصل ہیں' بلکہ ایک یہودی نومسلم کے حوالے سے یہ جان کر میں ششدر رہ گیا کہ اسرائیل میں شرعی عدالتیں تک موجود ہیں' وہاں مسلمان پارلیمنٹ کے ارکان تک منتخب ہوتے ہیں اور اسرائیل میں ایک مسلمان نوجوان داڑھی بھی رکھ سکتا ہے اور مسلمان لڑکی نقاب بھی اوڑھ سکتی ہے' لیکن عراق' شام اور تیونس میں مذہبی حلقے جن پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جس جبر کا شکار ہیں' ان کی تفصیلات جان کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ اسی طرح لیبیا کے قذافی نے گزشتہ چالیس سال سے اپنے عوام کو بدترین غلامی کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے' لیکن ہمارے علمائے عظام اور دینی رہنماؤں کے نزدیک وہ بھی اسلام کا ہیرو ہے' بلکہ گزشتہ دنوں قذافی کا بیٹا پاکستان آیا' تو جگہ جگہ اس کے لئے خیر مقدمی جلسے منعقد ہوئے اور اسے سیف الاسلام کے نامے سے موسوم کیا گیا۔ ان مثالوں سے کیا یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ ظلم وہی ظلم ہے جو بھارت کرے' جو اسرائیل کرے یا امریکہ کرے' لیکن کوئی نام نہاد مسلمان آمر مطلق اسلام اور اہل اسلام پر اس سے دس گنا زیادہ مظالم ڈھاتا رہے' تو وہ لائق برداشت ہے' وہ اسلام کا ہیرو ہے' میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ ناانصافی' جانبداری اور بے اصولی ہے' جس کی وجہ سے سارے عالم اسلام پر نحوست طاری ہوگئی ہے اور اللہ کی ناراضگی نے سارے ماحول کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔

چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مکمل انصاف اور توازن کا رویہ اختیار کریں۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ پاکستانی قوم بھی بش کے جارحانہ عزائم کے خلاف غیرت و حمیت کا بے مثال مظاہرہ کر رہی ہے' لیکن یہ تحریک اسی صورت میں مکمل ہوگی اور اس میں تب ہی اخلاقی وزن پیدا ہوگا' جب ہم ایک درجے میں امریکی صدر کے خلاف آواز بلند کریں تو لازماً دوسرے درجے میں عراقی آمر صدام کی بھی مذمت کریں اور دوٹوک انداز میں مطالبہ کریں کہ مظلوم عراقی مسلمانوں کو بے رحم' سفاک صدام سے نجات دلائی جائے۔ خدانخواستہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا اور صدام کے لئے ہمارے دلوں میں نرم گوشہ موجود رہا تو ہمارا مقدمہ خاصا کمزور ہو جائے گا اور قرآنی وعید کے مطابق ہم ظالم سے تعاون کے مجرم ٹھہریں گے اور اللہ کی تائید وحمایت سے محروم ہو جائیں گے۔ (سورۂ ہود۔ آیت 113)

(بشکریہ روزنامہ پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس
فاضل درسِ نظامی

''محدث'' کا انکارِ حدیث نمبر

ماہنامہ ''محدث'' ملتِ اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلّہ ہے جو عرصہ دراز سے لاہور سے شائع ہوتا ہے اور دینی حلقوں میں معروف اور پسندیدہ مجلّہ ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ جناب حضرت حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب ہیں۔ جو مشہور عالم دین ہیں اور اپنی علمی اور دینی وجاہت کے باعث اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اس مجلّہ میں حدیث کی اہمیت' عظمت' ضرورت اور دفاع سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگست وستمبر 2003ء کا ماہنامہ ''فتنۂ انکار حدیث'' اشاعت خاص کے طور پر شائع ہوا ہے۔ راقم کمترین چونکہ ملک سے باہر تھا اس لئے یہ رسالہ اب چند یوم پیشتر ہی موصول ہوا ہے۔ اس ماہنامہ میں انکار حدیث کے اسباب' اس کی تاریخ' اس کے نظریات اور انکار کرنے والوں کے باہمی اختلافات کو پیش کیا گیا ہے اور سارا مواد بہت محنت اور کاوش سے دستیاب کیا گیا ہے۔ زیادہ اعتراض اطاعت رسول ﷺ کی تعبیر اور مرکز ملت کے تصور پر کیا گیا ہے۔ اپنے نظریات کا اظہار اور قرآن کریم کی تعبیر کا حق سب کو پہنچتا ہے اور قرآن کریم سے محبت اور مسلمانوں کے حال پر غم خواری سب کو ہے۔ یہ کسی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہم سب مسلمانوں کو قرآن کریم سے محبت ہے' ملت مسلمہ کا مفاد پیش نظر ہے اور ہر شخص کو اس بات کی تڑپ ہے کہ مسلمان قرآن کریم پر عمل کر کے اپنی زبوں حالی سے نجات پائیں اور ایک زندہ اور متحرک قوم بن جائیں۔ نظریات کے اختلاف اور قرآن فہمی کے مختلف طریقے اختیار کرنے سے' ہمیں ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی ایک دوسرے سے مغائرت اختیار کرنی چاہئے۔ بلکہ ہر اختلاف افہام وتفہیم سے دور کرنا چاہئے۔ احقاق حق اور ابطال کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں۔

قرآن حکیم کا اصل الاصول اور العروۃ الوثقیٰ یہ ہے کہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کا واجب الاتباع ہے۔ اس کے علاوہ کسی کا حکم واجب الاتباع نہیں ہے۔ ان الحکم الا للہ (۶/۵۷)۔ ولا یشرك فی حکمہ احدا (۱۸/۲۶) آیات اس پر دال ہیں۔ قرآن کریم نے ضابطہ حیات (Ideology) کو ناقابل تقسیم قرار دیا ہے اور اس میں کسی قسم کی آمیزش کو قطعاً منع فرمایا ہے۔ افتومنون

ببعض الکتاب و تکفرون ببعض۔ قرآن کریم کا نظریہ ہے کہ اگر خالص قرآن کریم کی اطاعت نہ کی گئی تو اس کا نتیجہ خزی فی الحیوٰۃ الدنیا والآخرۃ ہوگا۔ اس لئے مسلمانوں پر لازم تھا کہ خالص قرآن کریم کے نظریات کا اتباع کرتے اور اس میں خارج از قرآن نظریات کو داخل نہ ہونے دیتے۔ لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی بلکہ پوری انسانیت کی بدبختی کا وہ روز اول تھا جب مسلمانوں نے ملوکیت کے زیر اثر دو دروازے ایسے وا کر دیئے جن سے قرآن کریم کے نظریات و احکامات پرکھنے کا معیار ہاتھ سے جاتا رہا اور اس کی وحی الٰہی ہونے کی منفرد حقیقت بھی ختم ہوگئی۔ بلکہ اس کے خالص نظریات کی اہمیت بھی جاتی رہی۔ اس کے نظریات میں انسانی خیالات کی آمیزش ہوگئی اور یوں قرآن کریم کے نظریات' عقائد و احکامات خالص نہیں رہے۔ جس کے سبب اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی خالص نہیں رہی۔

حدیث شریف کے سلسلہ میں اصل نقطہ ماسکہ' اس کی اہمیت وعظمت' اس کی شرعی و آئینی حیثیت' اس کی حفاظت وصیانت اور صحت وسقم نہیں ہے۔ بلکہ اصلی بحث اس کا وحی الٰہی قرار دینا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً علمائے کرام و فقہائے عظام احادیث پر برابر مضامین تحریر کرتے چلے آرہے ہیں اور کتابوں پر کتابیں شائع ہوتی جارہی ہیں۔ لیکن کوئی صاحب تصنیف عالم تھوڑی دیر رک کر یہ نہیں سوچتا کہ اصل بحث ہے کیا؟ اور اس کا جواب کیا ہے؟ متذکرہ صدر موقر جریدہ میں بھی اس مسئلہ کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا اور صرف ایک مقام پر حضرت مولانا قاری محمد موسیٰ صاحب مدظلہ نے اس کا تذکرہ صفحہ 218 پر فرمایا کہ ''یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآن کی طرح سنت وحدیث رسولؐ بھی منزل من اللہ اور وحی الٰہی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو۔'' مولانا روم کا شعر بھی تحریر فرمایا۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

جبکہ حضرت اقدس نے سنت نبوی کو حکمت اور وحی خفی قرار دیا ہے (صفحہ ۲۱۹) (حکمت کا صحیح مفہوم آگے آتا ہے اس معاملہ میں بھی حضرت سے تسامُح ہوا ہے)۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ علماء کرام اس نقطۂ نگاہ سے واقف نہیں ہیں بلکہ حدیث کی ساری بحث میں یہ موضوع ایسا ہے کہ علماء کرام خوب واقف ہیں کہ ان کا یہ موقف نہایت کمزور اور انتہائی ضعیف ہے اور کسی طریقہ سے بھی احادیث جو عرصہ بعد جمع و مدون کی گئیں' وحی ثابت نہیں کی جاسکتیں اور وحی ثابت نہ ہونے کی صورت میں حدیث شریف کی وہ اہمیت نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل رسالہ میں حدیث پر جامع مضامین تحریر کئے گئے' عربوں کے حافظے کو سراہا گیا' جو بالکل غیر متعلقہ عنوان ہے۔ مگر اس مسئلہ کو صرف ایک جگہ بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ ساری بحث کا مرکز ومحور یہی ایک نقطہ ہے اور امت مسلمہ کو جس قدر نقصان اس غلط نظریہ سے ہوا اور کسی نظریہ سے نہیں ہوا۔ جبکہ حقیقتاً حدیث شریف کے وحی الٰہی نہ ہونے سے علماء کرام کی ساری تیار کردہ عمارت خاک

کے تو دہ کی طرح زمین بوس ہو جاتی ہے۔

ایک قابل غور بات یہ ہے کہ ہم جن مجامع کو بطور Euphemism احادیث کا ذخیرہ کہتے ہیں وہ اصلاً حدیث کا ذخیرہ نہیں ہے۔ وہ الفاظ جو حضورﷺ کے دہنِ مبارک سے صادر ہوئے وہ حدیث تھے۔ لیکن جب وہ مفہوم راوی نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تو وہ حدیث نہیں رہے۔ بلکہ روایت بن گئے اور وہ الفاظ حضورﷺ کے نہیں رہے بلکہ راوی کے اپنے الفاظ ہو گئے۔ کیونکہ علماء خود اعتراف کرتے ہیں کہ احادیث بالمعنی روایت ہوئی ہیں اور اسی لئے احادیث کے آخر میں او کما قال علیہ السلام شامل کیا جاتا ہے۔ آج جن احادیث کو وحی قرار دیا جاتا ہے اول تو یہ احادیث حضورﷺ کی احادیث ہی نہیں ہیں' بلکہ ذخیرۂ روایات ہیں' کیونکہ ڈھائی سو سال تک جو الفاظ پشت در پشت اور نسلاً بعد نسلٍ ایک زبان سے دوسری زبان اور دوسری سے تیسری' چوتھی' پانچویں' چھٹی پر منتقل ہوتے آ رہے ہوں ان کا اپنی اصل شکل میں رہنا بالکل ناممکن ہے۔ فلہٰذا وہ روایات احادیثِ رسولﷺ ہیں ہی نہیں اور جتنی بحث رسالہ مذکورہ میں حدیث کے بارے میں کی گئی ہے کیونکہ وہ حدیث کو وحی قرار دینے کے بعد کی گئی ہے' لہٰذا وہ اس نقطہ کے پیش نظر رکھنے سے بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جس اساس پر ساری عمارت تعمیر کی گئی تھی وہ اساس ہی غلط ہے۔ کیونکہ رواۃ کرام کے بیان کردہ اپنے الفاظ کسی حال میں بھی وحی نہیں ہو سکتے۔ اس نقطہ پر علماء کرام جس قدر بھی غور و خوض فرمائیں وہ کم ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ تمام دلائل جو احادیث کی شرعی و آئینی حیثیت کے سلسلہ میں پیش کئے گئے وہ بالکل غیر متعلقہ (misfit) قرار پا جاتے ہیں۔ البتہ یہ بات کہ حدیث یا صحیح معنوں میں روایات وحی نہیں ہیں' اس کا ثبوت فراہم کرنا علمائے قرآن کی ذمہ داری اور ان کا فرض تھا۔ جس کو انہوں نے خوب خوب ادا کیا اور وہ وہ دلائل و براہین پیش کئے' جن کے جوابات دینے سے علماء روایات قطعاً قاصر رہے۔

قرآن کریم نے وحی کی امتیازی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن کو محک و میزان قرار دے کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن حکیم تو واقعاً وحی ہے' لیکن روایات چونکہ ان امتیازی خصوصیات کی حامل نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ وحی نہیں ہیں۔ وحی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وحی کی مثل نہیں بن سکتی۔

وحی کی مثل نہیں بن سکتی: وحی کی ایک امتیازی خصوصیت جو متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے یہ ہے کہ اس کی مثل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس بارے میں قرآن کریم کی واضح نص موجود ہے کہ اس کی مثل نہیں لائی جا سکتی۔

> وان کنتم فی ریبٍ مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتو بسورہ من مثلہٖ (القرآن ۲/۲۳) (ترجمہ) اور اگر تم لوگ اس کلام سے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے شک میں پڑے ہو' پس اگر تم سچے ہو' تو تم (بھی) ایک ایسی ہی سورت بنا لاؤ۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے واضح طور پر وحی کا معیار مقرر فرما دیا ہے' کہ وحی کی مثل نہیں بن سکتی۔ اس آیت کریمہ میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ آیت میں معارضہ صرف قرآن کریم کا نہیں کیا گیا کہ کفار قرآن کا مثل نہیں لا سکتے۔ بلکہ اس آیت میں معارضہ مما نزلنا کا کیا گیا ہے چونکہ یہاں ما تعمیم کا ہے۔ جس کے معنی ہیں معارضہ بَر اس چیز کا کیا گیا ہے جو کچھ بھی نازل کی گئی ہے اور صرف قرآن کا معارضہ نہیں کیا گیا۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر غور کرنے کے بعد ہر شخص باآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وحی صرف قرآن میں ہے جس کا مثیل ونظیر نہیں ہے۔ قرآن کے علاوہ کوئی چیز بھی بے مثل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ روایات بھی بے مثل نہیں ہیں اور ہر طرح کی روایات کتب معتبرہ میں چلی آ رہی ہیں۔

وحی قطعی ہوتی ہے۔ ظنی نہیں ہوسکتی: ایمان وعمل کی ساری عمارت یقین پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ میں ذرا بھی شک وتردد واقع ہو جائے تو اس پر دل جمعی کے ساتھ ایمان نہیں لایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان سے ایمان کا مطالبہ کیا تو وحی کو محفوظ اور منضبط شکل میں رکھنے کا بھی وعدہ اور اہتمام فرمایا تاکہ ہر شخص یقینی طور پر ایمان لا سکے اسی لئے حضور ﷺ نے قرآن کو محفوظ کرا کر امت کے حوالہ کیا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم بھی یقینی طور پر اس وحی پر ایمان لائے اس کے علاوہ وہ برگزیدہ ہستیاں کسی وحی پر ایمان نہیں لائیں۔ قرآن کے علاوہ ہر چیز ظنی ہے اور ظن پر تو ایمان لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس پر کسی شخص کی طبیعت بھی مطمئن نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ارشاد حق ہے۔

ان الظن لا یغنی من الحق شیأ
(۵۳/۲۸)

تحقیق گمان حق سے کچھ کفایت نہیں کرتا۔

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یاایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بچو بہت گمانوں سے' تحقیق بعض گمان گناہ ہیں۔

ان واضح آیات کے باوجود جن میں مومنین کو ظن سے بچنے کی ہدایت ہے کیا خود اللہ تعالیٰ انسان کو اس حالت پر مجبور کرتا کہ اس کے ایمان ویقین کی بنیاد واضح نہ ہو اور اس سے کسی غیر واضح چیز پر ایمان لانے کا مطالبہ ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وحی قطعی اور یقینی ہوتی ہے اور وہ صرف قرآن کریم ہے۔ قولہ الحق۔ روایات کے مشہور جامعین بھی اس سے متفق ہیں کہ روایات قطعی نہیں ہوتیں کیونکہ ہر وہ روایت جس کا آغاز قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہوتا ہے' اس کا اختتام اوکما قال علیہ السلام پر ہوتا ہے۔

وحی متلو ہوتی ہے: ہم مسلمانوں میں صدر اول کے کچھ بعد سے وحی کی تقسیم متلو اور غیر متلو میں کر دی گئی تھی جس کی رو سے قرآن کریم وحی متلو ہے اور حدیث شریف وحی غیر متلو قرار پائی۔ لیکن قرآن کریم نے وحی کو صرف متلو قرار دیا ہے

غیر متلو وحی کا تصور بھی خلاف قرآن ہے۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ عزاسمہ ہے۔

كذلك ارسلنك فى امة قد خلت من قبلها امم لتتلوا عليهم الذى اوحينا اليك وهم يكفرون بالرحمن (۱۳/۳۰)

اسی طرح (اے محمد) ہم نے تم کو اس امت میں' جس سے پہلے بہت امتیں گزر چکی ہیں بھیجا تا کہ تم ان پر' وہ جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے' تلاوت کردو۔

اس آیت کریمہ سے بالکل واضح ہے کہ مطلق ما یوحیٰ متلو ہے جس کی تلاوت حضور امت کے سامنے فرمایا کرتے تھے۔ وحی کل کی کل متلو ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اس آیت کے پیش نظر غیر متلو وحی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

وحی صرف جلی ہے: وحی کی ایک قسم کو خفی ماننا اور اس کو قرآن کے باہر تسلیم کرنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ وحی صرف جلی ہوتی ہے جبکہ حضورﷺ کو حکم تھا کہ وحی کو امت تک ضرور پہنچا دیں اور اس کو مخفی نہ رکھیں تو وحی خفی کس طرح ہوسکتی ہے۔ حضورﷺ کو حکم خداوندی تھا۔

لا ايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك' وان لم تفعل فما بلغت رسالته (۵/۶۷)۔

اے رسول جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو۔ اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کا پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔

وحی الٰہی کی تبلیغ حضورﷺ پر ایسی فرض تھی کہ کسی حال میں بھی اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن حدیثیں صرف حیا یا دل جوئی کے خیال سے روکی جا سکتی تھیں۔ رسول کریمﷺ کے گھر میں غریب لوگ کھانا کھانے آتے تھے۔ وہ کھانا تیار ہونے سے کافی عرصہ پہلے آ جاتے تھے اور کھانا ختم کرنے کے بعد بھی حضورﷺ کے خانۂ محترم میں بیٹھے رہتے تھے۔ جو اگرچہ حضورﷺ کو گراں گذرتا تھا۔ اگر آپ انہیں اپنے حدیثی بیان سے منع فرما دیتے تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لیکن آپ شرم وحیا اور دل جوئی کی وجہ سے ایسی سچی حدیث بھی بیان نہیں فرماتے تھے۔ لیکن جب یہی بات قرآن کریم میں نازل ہو گئی تو اس وقت اس بات کے بیان میں حیا آپ کو ہرگز مانع نہ ہوسکی۔ اس سے ثابت ہے کہ وحی کو تو حضورﷺ کسی حال میں بھی خفیہ رکھ ہی نہیں سکتے تھے' فوری طور پر آپ اس وحی کو امت میں پہنچا دیتے تھے۔ وحی خفی کا تصور ہی باطل ہے۔

وحی میں تضاد نہیں ہوسکتا: ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافاً كثيراً (۴/۸۲)۔ (ترجمہ) اور اگر یہ اللہ کے سوا' کسی اور کی طرف سے ہوتا' تو اس میں بکثرت اختلاف پاتے۔

آیت مندرجہ بالا نے یہ بات واضح کر دی کہ وحی میں تضاد واقع نہیں ہوسکتا۔ لیکن احادیث رسولﷺ کا معاملہ بالکل اس کے نقیض ہے۔ ہر فرقہ کی مختلف احادیث

ہیں اور ہر فرقے کی احادیث دوسرے فرقے کی احادیث سے مختلف ہیں۔ مختلف فرقوں کی مختلف اور ایک دوسرے سے متضاد احادیث ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ وحی نہیں ہیں۔

وحی کی مندرجہ بالا خصوصیات کے پیش نظر یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ وحی صرف قرآن کریم میں ہے اور روایات کسی طور پر بھی وحی ثابت نہیں ہوسکتیں لہٰذا وہ دین کا حصہ نہیں ہیں۔ مکمل دین قرآن کریم کے اندر ہے۔

امت صرف قرآن کی وارث ہے۔ وحی خارج از قرآن کی وارث نہیں: والذی اوحینا الیک من الکتٰب ھوا لحق مصدقاً لما بین یدیہ ان اللہ لعبادہ خبیر بصیر۔ ثم اورثنا الکتٰب الذین اصطفینا من عبادنا (ترجمہ) اور ہم نے جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی وہ بالکل ٹھیک ہے اور جو (کتابیں اس سے پہلے کی) اس کے سامنے ہیں یہ ان کی تصدیق بھی کرتی ہے' بے شک اللہ اپنے بندوں سے خوب واقف ہے اور دیکھ رہا ہے۔ پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے خاص ان کو کتاب کا وارث بنایا جنہیں ہم نے منتخب کیا۔

اس آیت کریمہ میں من بیانیہ ہے اور کسی صورت بھی تبعیضیہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر تبعیضیہ قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے کہ قرآن کا بعض حصہ حق ہے اور بعض باطل۔ لیکن چونکہ یہ بات درست نہیں ہے اس لئے یہاں من بیانیہ ہی لیا جا سکتا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ کتاب ہے۔

نیز یہ کہ ثم اورثنا الکتٰب سے مزید وضاحت کی گئی ہے کہ وحی صرف کتاب ہے جس کا وارث امت مسلمہ کو قرار دیا گیا ہے۔ امت مسلمہ صرف کتاب کی وارث ہے۔ اگر وحی قرآن کریم کے علاوہ بھی ہوتی تو امت مسلمہ اس کی بھی وارث قرار پاتی۔ یہ آیت کریمہ ایسی واضح ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ امت مسلمہ صرف قرآن کی وارث ہے اور اسی کے اتباع کی مکلّف۔

حکمت کے متعلق بھی علماء روایات کا عقیدہ ہے کہ حکمت سے مراد حدیث شریف ہے اور یہی بات حضرت مولانا قاری محمد موسیٰ صاحب نے رسالہ موقرہ کے صفحہ ۲۱۸ پر مرقوم فرمائی ہے۔ ہر چند کہ یہ عقیدہ صرف حضرت مولانا صاحب موصوف کا منفرد عقیدہ نہیں ہے' بلکہ تمام علماء روایات کا یہی عقیدہ ہے۔ تاہم یہ بالبداہت قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآنی آیات سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ حکمت یقیناً منزل من اللہ ہے مگر یہ بھی قرآن کریم کے اندر ہی محفوظ ہے' ہر قانون کی غایت' اس کی لم' اس کا Rationale' اس کی حکمت اور اس کی Why of it ہوتی ہے' مثلاً ان تنصر اللہ ینصر کم ویثبت اقدامکم میں اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ اگر تم نے اللہ کی مدد کی تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔ اللہ کی مدد کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

ہماری مدد فرمائے گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہمارے قدموں کو جمادے گا۔ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر میں صلوٰۃ کی حکمت یہ فرمائی گئی ہے کہ صلوٰۃ فحشاء و منکر سے باز رکھتی ہے۔ روزوں کی حکمت لتکبر اللہ علی ماھذکم بیان فرمائی ہے' کہ روزوں کی حکمت یہ ہے کہ قانون خداوندی کو غالب کیا جائے۔ آیت کریمہ فمن تبع ھدی فلا خوف علیھم ولا یحزنون میں ہدایت خداوندی نازل فرمانے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر وحی الٰہی کا اتباع کیا جائے گا تو معاشرہ میں کسی قسم کا خوف وحزن باقی نہیں رہے گا۔ اتباع وحی کی حکمت یہ ہے کہ معاشرہ سے خوف وحزن جاتا رہے۔ کتاب وحکمت دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں اور قرآن حکیم کے اندر محفوظ ہیں۔

انزل علیک الکتاب والحکمۃ (۴/۱۱۳)

خدا نے تیری طرف کتاب وحکمت کو نازل کیا۔

وما انزل علیکم من الکتٰب و الحکمۃ یعظکم بہ (۲/۲۳۱)۔

اور جو کچھ تمہارے پر کتاب وحکمت سے اتارا ہے' تم کو اس کے ساتھ نصیحت کرتا ہے۔

کتاب وحکمت کے لئے صرف ایک ضمیر بہ استعمال کر کے واضح کر دیا کہ کتاب وحکمت ایک ہی چیز ہے۔ نیز سورۃ احزاب میں فرمایا۔

واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من آیت اللہ و الحکمۃ ان اللہ کان لطیفا خبیراً۔

(اے نبی کی بیویو) تمہارے گھروں میں جو آیات خداوندی اور حکمت تلاوت کی جاتی ہے اس کو یاد رکھو' بے شک اللہ تعالیٰ لطیف وخبیر ہے۔

اس سے واضح ہے کہ حکمت کی تلاوت ہوتی ہے اور حکمت غیر متلو وحی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی قرآن سے باہر ہوسکتی ہے۔

جریدہ موقرہ میں ایک مکمل مضمون ''پرویز اور اطاعت رسول'' کے عنوان سے بھی تحریر کیا گیا ہے۔ جو محترم المقام جناب پروفیسر منظور احسن عباسی صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ یوں تو اس موقر رسالہ کے سارے مضامین سنجیدہ ہیں اور زبان بھی متین ہے اور مضامین تحقیق پر مبنی ہیں' لیکن پروفیسر صاحب موصوف کا انداز بالکل سوقیانہ ہے اور زبان بھی متانت سے گری ہوئی ہے۔ دینی مضامین میں یہ بات بہ نظر استحسان نہیں دیکھی جاتی اگرچہ فلمی دنیا کی بات دیگر ہے۔ آپ کس قدر بھی کسی سے اختلاف فرمائیں' لیکن نہ تو شرافت کا دامن ہاتھ سے دینا چاہئے اور نہ ہی زبان سوقیانہ اختیار کرنی چاہئے۔ ہمارے ہاں اگرچہ علماء کرام کو متہم کیا جاتا ہے کہ وہ مجادلہ ومحاربانہ لہجہ اور تلخ اور ترش زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس جریدہ میں تمام علماء نے عموماً شریفانہ لہجہ اختیار کیا ہے' لیکن تعجب ہے کہ پروفیسر صاحب نے' جن کو زیادہ محتاط ہونا چاہئے تھا انہوں نے پورا مضمون استخفاف' استحقار اور استہزاء کے پیرایہ میں رقم فرمایا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اور حضرت مولانا محمد رمضان

صاحب سلفی نے پرویز صاحب کے حوالہ سے ''مرکز ملت'' کے تصور سے تعرض فرمایا ہے' حضرت مولانا نے تو صرف انتقاد فرمایا ہے (جس کا جواب آگے آتا ہے) البتہ پروفیسر صاحب موصوف نے انتقاد کے علاوہ متبادل مرکز ملت ''حقیقی مرکز ملت کیا ہے'' کے نام سے پیش بھی فرمایا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ Verbative لفظ بہ لفظ' حرف بہ حرف' تحریر کئے جاتے ہیں:

''مرکز ملت وہ نہیں ہے جو اس وقت مسٹر پرویز کے ماؤف ذہن میں ہے بلکہ وہ ہے جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم ہوا۔ اور اب تک قائم ہے اور اسی کو چمٹے رہنے اور اسی سے وابستہ رہنے کا ارشاد اس حدیث میں ہے۔ وعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدین من بعدی' عضدا علیها بالتواجذ و تمسکوا بها و ایاکم محدثات الامور۔ تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور میرے بعد خلفاء راشدین مہدین کے طریقے کی پیروی کرو اور اس کو دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ رکھو اور اسی پر جمے رہو' اور خبردار نئی باتوں سے بچتے رہنا۔ نئی بات جس سے بچنے کی حضورؐ نے تاکید فرمائی ہے یہی مرکز ملت کا ناشدنی تصور ہے جس کے نام سے بھی ملت اسلامیہ بلکہ ملل عالم ناواقف ہیں''۔ (یہاں پروفیسر صاحب کا اقتباس ختم ہوا۔)

پروفیسر صاحب نے اپنے طویل مضمون کی جہاں لم ختم کی ہے اسے علم مناظرہ میں مُصادرہ علی المطلوب کہتے ہیں۔ یعنی جو دعویٰ ہے وہی دلیل۔ اہل علم خوب واقف ہیں کہ ''خصم'' کے سامنے جب دعویٰ ہی دلیل بن جائے تو وہ دعویٰ قابل قبول نہیں ہوتا۔ جو لوگ حدیث کو حجت نہیں مانتے ان کے سامنے حدیث سے دلیل دینا کونسی عقلمندی ہے۔

اطاعت رسولؐ کا صحیح طریقہ: علماء قرآن کے نزدیک' قرآن کریم میں غور و تفحص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اتباع وحی ہی اطاعت رسول ﷺ ہے چنانچہ آیت کریمہ' ان اولی الناس بابراہیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین امنوا واللہ لی المومنین (۳/۶۸)۔ (ترجمہ) بلاشبہ تمام لوگوں میں سے ابراہیم کے بعد سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو اس کی اتباع کرتے ہیں اور یہ نبی اور ان کے ساتھی مومن بھی (ابراہیم کے بہت قریب ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا مددگار ہے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قریب ترین شخص اس لئے بتایا گیا ہے کہ آپ ملتِ ابراہیم کے پیروکار تھے۔ نیز صحابہ کرامؓ کو بھی حضرت ابراہیمؑ کا اقرب کہا گیا ہے کیونکہ صحابہؓ حضورؐ کے متبع تھے اور حضورؐ حضرت ابراہیمؑ کے متبع تھے۔ اسی طرح وہ صحابہؓ بھی ابراہیمؑ کے متبع تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حضورؐ کے پاس حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے موصول شدہ احادیث و روایات کا کوئی ذخیرہ موجود نہیں تھا کہ آپ احادیث ابراہیمؑ

کا اتباع کر کے حضرت ابراہیمؑ کے اقرب بنے ہوں۔ اس کی اصل صورت، سورہ نمبر ۱۰۶/ ۹ و ۱۰۹/ ۱۰ سے واضح ہوتی ہے کہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ بھی وحی کے مطیع تھے اور حضورؐ بھی وحی کے متبع تھے اسی لئے حضورؐ کا اتباع بعینہٖ حضرت ابراہیمؑ کا اتباع تھا۔ اسی طرح صحابہؓ کا اتباعِ قرآن حضرت ابراہیمؑ کا اتباع تھا۔ نیز اسی توجیہ سے یہ بات قابل تسلیم ہے کہ چونکہ حضورؐ خود قرآن کریم کے متبع تھے اس لئے قرآن کا اتباع کرنے سے ہی حضورؐ کا صحیح اتباع ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مایوحیٰ اور ماانزل کا اتباع ہی انبیاء کرام کا اتباع ہے اور جملہ انبیاء کی طرف مایوحیٰ اور ماانزل صرف کتاب ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین وانزل معھم الکتاب کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور ان سب کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی کیونکہ جملہ انبیاء کرام کی وحی اور کتب کی تعلیم ایک ہی تھی اور ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس لئے جملہ انبیاء کرام ایک ہی تعلیم کے متبع تھے پس ثابت ہوا کہ قرآن کریم کا اتباع ہی حضرت ابراہیمؑ سمیت جملہ انبیاء کا اتباع ہے۔ اسی کی اتباع ملت ابراہیم یعنی ضابطۂ ابراہیم کی اتباع ہے۔ اسی (قرآن) کی اتباع اسوۂ ابراہیمی (۶۰/۴ کی اتباع ہے اور اسی کا اتباع اسوۂ محمدیؐ کا اتباع ہے (۳۳/۲۱) جس کے لئے حدیث شریف یا وحی خفی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اللہ و رسول کی اطاعت سے دو الگ الگ مطاعوں کی اطاعت تصور کرنا درست نہیں ہے۔ یعنی اللہ کا حکم الگ اور رسول کا حکم الگ، حالانکہ دو حاکم اور دو حکم ماننا قرآن کریم کی محکم آیات کے خلاف ہے۔ ان الحکم الا للہ (۶/۵۷) لا یشرک فی حکمہٖ احداً (۱۸/۲۶)۔ ان آیات کے مطابق اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا یہ ترجمہ ''اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو'' مطلقاً غلط ہے بلکہ اس میں واؤ کے معنی بذریعہ ہیں جیسے کہ برآۃ من اللہ و رسولہٖ الی الذین عاھدتم من المشرکین فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھر وا علموا انکم غیر معجزی اللہ وان اللہ مخزی الکٰفرین (۹/۱)۔ (ترجمہ) بیزاری ہے اللہ کی بذریعے اپنے رسول کے ان لوگوں سے جن کے ساتھ تم نے مشرکوں سے عہد کیا تھا۔ (اور اعلان اور فیصلہ ہے اللہ کا اپنے رسول کے ذریعے کہ اے مشرکو) تم زمین پر چار ماہ حرمت والے چل پھر لو۔ اور جان لو یہ کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور بے شک اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔

اسی طرح آذان من اللہ و رسولہٖ الخ' میں ''و'' بذریعہ کے معنی میں آئی ہے (ترجمہ) اعلان ہے اللہ کا اپنے رسول کے ذریعے حج اکبر کے دن کہ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان اپنے رسول کے ذریعے کرایا ہے جیسا کہ ظاہر ہے یہ اللہ اور رسول کے دو اعلان نہیں تھے بلکہ ایک ہی

اعلان تھا۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے کرایا تھا کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے۔ نیز ما وعدنا اللہ و رسولہ الا غروراً (۱۲/۳۳) (ترجمہ) (منافق کہنے لگے) نہیں وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ نے بذریعہ اپنے رسول کے مگر فریب دینے کو) یہاں بھی واؤ بمعنی بذریعے آیا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے ذریعے ہی وعدہ فرماتا ہے' خود آ کر نہ کوئی وعدہ لیتا ہے اور نہ کوئی وعدہ دیتا ہے۔

اللہ و رسول سے مراد مرکز ملت ہے: اصل یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت دو مطاعوں کی اطاعت نہیں ہے۔ جیسا کہ تین مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہے یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا اور کسی کی بھی ہے حتیٰ کہ خود رسولؐ کے متعلق بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان کو بھی حق حاصل نہیں ہے کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائیں۔ لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکز دین وہ Central Authority ہے جہاں سے قرآنی احکامات نافذ ہوں اور جہاں اللہ کی اطاعت رسول کے ذریعے کی جا سکتی ہو۔ یہ حقیقت کہ اللہ اور رسول سے مراد مرکز ملت ہے قرآن کریم میں اس قدر واضح ہے کہ جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔

(۱) یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و رسولہ' ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون (۸/۲۰) اے مومنو' تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو' درآنحالیکہ تم سن رہے ہو۔

یہاں اللہ و رسول دو کا ذکر ہے اور عنہ' کی ضمیر واحد ہے۔ اسی طرح سورہ انفال میں دوسری جگہ ہے۔

(۲) یاایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (۸/۲۴)۔ اے جماعت مومنین تم اللہ اور رسول کی دعوت کا جواب دو جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں (موت سے نکال کر) زندگی عطا کر دے۔

یہاں بھی اللہ و رسول کا ذکر ہے اور صیغہ (دعاکم) واحد ہے۔ اسی طرح سورہ نور میں ہے۔

(۳) واذا دعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون وان یکن لھم الحق یاتوآ الیہ مذعنین (۲۴/۴۸)۔ (ترجمہ) اور جب ان لوگوں کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے متنازعہ فیہ امور میں فیصلہ کرے تو ان میں کا ایک فریق اس سے گریز کرتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو (جس سے وہ سمجھیں کہ فیصلہ ان کے حق میں جائے گا) وہ اس کی طرف سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کی طرف بلائے جانے کا ذکر ہے لیکن بعد میں لیحکم میں صیغہ واحد ہے اور الیہ میں ضمیر واحد ہے۔

(۴) یسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ و للرسول (۸/۱) (ترجمہ) تجھ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ مال غنیمت اللہ اور رسول کا ہے۔

اس آیت سے آگے چل کر ہے۔

(۵) واعلموا انما غنمتم من شئي فان لله فمسه وللرسول (ترجمہ) اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں مال غنیمت سے ملے اس کا پانچواں حصہ ''اللہ اور رسول'' کا ہے۔

(۶) کتب اللہ لا غلبن انا و رسلی (۵۸/۲۱)۔ (ترجمہ) ضرور ہے کہ میں اور میرے رسل غالب رہیں گے۔

ان تمام مقامات نیز (۵/۳۳) میں اللہ اور رسول سے مراد امام' امیر' مرکزی اتھارٹی' یا مرکز ملت ہے۔ یہ مفہوم کوئی نیا نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے مفسرین نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اس پر ہمارے دور کی دو تفسیریں ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی اور تفہیم القرآن جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم کی شاہد ہیں۔

ثابت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے الفاظ ایک قرآنی اصطلاح کے طور پر آئے ہیں اور اس سے مراد اس نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے جو نظام حضور ﷺ نے قائم فرمایا ہے اور اس نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت کوئی الگ اطاعت نہیں ہے جس کے لئے حدیث شریف یا وحی خفی کا ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

ہمارے ہاں چونکہ ملوکیت کے در آنے کی وجہ سے اسلامی نظام کا تصور محو ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نظام کے چلانے کی آخری اتھارٹی کے تصور کی بھی ضرورت نہیں رہی' لیکن آپ جب بھی اسلام بطور نظام مانیں گے' آخر کوئی نہ کوئی تو حاکم اعلیٰ کا مقام متعین فرمائیں گے۔ اگر آپ کو مرکز ملت کا لفظ خوش آئند معلوم نہیں ہوتا۔ آپ اس کا کوئی اور نام قرار دے لیں۔ لیکن کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھنا ہوگا۔ ہاں البتہ اگر آپ نظام کا تصور ساقط کر دیں' اور مذہب کو نجی' ذاتی معاملہ قرار دے لیں تو پھر بے شک کسی فائنل اتھارٹی کی ضرورت نہیں رہے گی' اور یہی علماء کرام کی دلی خواہش ہے اور یہی اسلام کا تصور ان کا ایک ہزار سال سے چلا آ رہا ہے' اس صورت میں عملاً اطاعت رسول کا مفہوم روایات پر عمل کرنا رہ جاتا ہے۔ لیکن اس میں اسلام کے بحیثیت نظام کے غلبہ حاصل کرنے کا کوئی تصور نہیں رہتا۔ کیونکہ روایات پر عمل غیر اسلامی حکومت میں بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔

تاکید مزید اور تائید قرآنی کے طور پر عرض ہے کہ سورۂ یٰسین شریف میں ارشاد حضرت باری تعالیٰ عز اسمہ ہے وما علمنہ الشعر وما ینبغی لہ' ان ھو الا ذکر و قرآن مبین۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم بھی حضور اکرم کو انسانیت کی راہنمائی کے لئے ملا وہ صرف اور صرف قرآن کریم ہے۔ قرآن کے علاوہ اور کوئی علم حضور ﷺ کو ذات باری تعالیٰ سے حاصل نہیں ہوا۔ عربی دان حضرات اور بالخصوص ہمارے علماء کرام اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جب مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو' تو صرف استثنیٰ یعنی الا حصر کا فائدہ دیتا ہے کہ نہیں وہ تعلیم ہماری کچھ بھی مگر وہ صرف قرآن ہے' ذکر اور قرآن کے درمیان واؤ عاطفہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے جو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آئی

ہے گذشتہ واقعات کا جو علم حضرت مریمؑ اور حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں حضورﷺ کو عطا ہوا' اس کی وضاحت فرما دی کہ ذالک من انباء الغیب نوحی الیک۔ اسی طرح فتح مکہ کا علم حضورؐ کو ہوا' وہ قرآن کریم کے ذریعے ہی ہوا' قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی ذریعۂ علم حضور کے پاس گذشتہ اور آئندہ واقعات معلوم کرنے کا نہیں تھا۔ جو روایات حضرت امام مہدی کی تشریف آوری' نزولِ مسیح' دجال' دابۃ الارض کے واقعات کی تفصیل ہیں ان میں سے کسی کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے لہٰذا یہ سب موضوع اور قرآن حکیم کی صریح تعلیم کے خلاف ہیں لیکن ہماری بدقسمتی کہ یہ تمام نظریات ہم میں موجود ہیں اور ان ہی غلط عقائد کی وجہ سے باطل فرقے موجود ہیں۔

ابتدائے مضمون میں عرض کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے زوال کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ جن میں سے ایک کی تفصیل عرض کر دی گئی ہے کہ حدیث کو وحی قرار دینے سے قرآن کریم کے اصل نظریات پس پشت کر دیئے گئے اور غیر قرآنی نظریات پیش نظر رہنے لگے۔ دوسرا سبب قرآن فہمی کا غلط طریقہ ہے جس سے قرآن کریم کی صحیح تعلیم نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اب اس کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

ہماری تفاسیر میں ایک نظریہ شان نزول کا پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ یہ آیت فلاں یہودی کے حق میں نازل ہوئی تھی اور یہ فلاں منافق کے بارے میں۔ یہ آیت فلاں صحابی کی شان میں نازل ہوئی تھی اور یہ آیت اہل بیت کے فلاں محترم فرد کے لئے' اس طرح قرآنی احکام کی عمومیت' عالمگیریت' ابدیت کو جو قیامت تک پوری نوع انسانی کے لئے ہے' صرف چند افراد تک محدود کر کے رکھ دیا گیا۔ اس طرح شان نزول کا عقیدہ فہم قرآن کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ جو کسی بھی آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی طرف آنے ہی نہیں دیتا اور حالت یہ ہوتی ہے کہ آیت تو لے لی قرآن سے' اور شان نزول تفسیروں سے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اور صورت یہ ہے کہ ایک ایک آیت کے کئی کئی شان نزول ہیں۔ پھر ہر فرقے کے الگ الگ شان نزول اور ہر شان نزول باندازِ تشکیک مندرج ہے تاکہ کوئی یقینی بات مل ہی نہ سکے۔ قرآن کریم کی آیات قطعی اور یقینی ہیں لیکن شان نزول اور روایات سب ظنی اور غیر یقینی ہیں۔ ان کے سہارے سے قرآن کریم کی تفسیر کرنے سے قرآن کریم کی ساری تعلیم مشکوک' ظنی اور غیر قطعی ہو جاتی ہے۔

قرآن حکیم نے قرآن فہمی کے طریقے خود ہی مقرر فرمائے ہیں جن سے ہمارے مفسرین نے قطعاً استفادہ نہیں کیا۔ سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ عربوں کی روزمرہ کی گفتگو کے مطابق ہے فو رب السماء والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون (۵۱/۲۳)۔ آسمان اور زمین کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ قرآن حق ہے۔ اس کا انداز کلام اس طرح کا ہے جس طرح تم آپس میں گفتگو کرتے ہو۔ قرآن کریم عربی مبین میں نازل ہوا (۱۹۲/۲۶)۔ غیر ذی عوج (۳۹/۲۸) ہے اس میں کوئی کجی نہیں۔ لہٰذا قرآن فہمی کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہر مقام پر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ الفاظ کی

حاکمیت کو قائم رکھا جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ کے وہ Original معنی لئے جائیں جو نزول قرآن کے وقت مروج تھے۔ مرور ایام سے زبانوں کے الفاظ اپنے اصل معنی چھوڑ دیتے ہیں اور دوسرے معانی اختیار کر لیتے ہیں چنانچہ قرآن کریم کے الفاظ' ذکر' تذکیر' وسیلہ' تہجد' وحی' مغفرۃ' شفاعت' امام' تسبیح' عبادت' الہ' وغیرہ بے شمار الفاظ ہیں جن کے معنی مرور ایام سے بدل گئے ہیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ ان الفاظ کے وہی معنی لئے جائیں جو نزول قرآن کے وقت ان کے معنی تھے لیکن ہمارے مفسرین نے قرآن کریم کے الفاظ کے وہ معانی نہیں لئے جو نزول قرآن کے دوران تھے اور روایات کے زیر اثر وہ معانی اختیار کئے جو نزول قرآن کے وقت نہیں تھے۔ اس سے قرآن کریم کی صحیح تعلیم مخفی ہو گئی اور غیر قرآنی نظریات رواج پا گئے۔

دوسرا طریقہ قرآن کریم نے اپنے سمجھنے کا تصریف الآیات قرار دیا ہے اور یہ طریقہ بہت اہم اور ضروری ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم کے ساتھ ولا یاتونک بمثل الا جئنک بالحق واحسن تفسیرا (۲۵/۳۳)۔ (مفہوم) اے رسول لوگ آپ کے پاس قرآن کی مثل نہیں لائیں گے مگر ہم ہی ہیں جو آپ کے پاس حق (قرآن) اور اس کی تفسیر لاتے ہیں۔ اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کر دی ہے۔ قد فصلنا الایات لقوم یفقھون (۶/۹۸)۔ نیز فرمایا کہ انظر کیف نصرف الایات لعلھم یفقھون۔ دیکھو ہم کس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ لوگ ان میں غور کریں۔ حضور علیہ السلام کا طریقۂ تفسیر بھی تصریف آیات کے ساتھ تفسیر کرنے کا تھا۔ کذالک نصرف الایات ولیقولوا درست ولنبینہ' لقوم یعلمون (۶/۱۰۵)۔ ہم آیات پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیں تا نکہ لوگ کہہ دیں کہ آپ نے خوب خوب سمجھا دیا ہے (اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تا کہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیتوں کی خود تبئین کر دی۔ حضور ﷺ کی سنت یہی ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کریں۔ قرآن کریم میں جو آیات بار بار پھیر پھیر کر لائی جاتی ہیں تو ان کا کوئی مقصد ہے' یونہی بلا مقصد بار بار نہیں دہرائی جاتیں۔

تصریف آیات کا طریقہ اختیار کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ خارج از قرآن نظریات کی جڑ کٹ جاتی ہے اور خارج از قرآن نظریات قرآن میں داخل نہیں ہو سکتے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے قرآن کریم کے مقرر کردہ ان دونوں اصولوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ جس کی وجہ سے خارج از قرآن نظریات داخلِ تفاسیر ہو گئے۔ قرآن حکیم نے زانی کی سزا سو کوڑے مقرر فرمائی ہے لیکن مبنی بر روایات تفاسیر میں زانی کی سزا رجم ہے اس طرح رجم کرنے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ ان مفسرین کرام کی اطاعت ہوتی ہے جنہوں نے یہ نظریہ

شاملِ قرآن کیا ہے۔ مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ۵/۱ حصہ اسلامی حکومت کے لئے مختص کر کے' باقی ۴ حصص یتامیٰ' مساکین' ابن سبیل اور مجاہدین کے رشتہ داروں کے لئے مخصوص کئے ہیں جو بہت واضح احکام ہیں لیکن حضرت مولانا صفی الرحمٰن صاحب نے اپنے مضمون میں اسی رسالہ کے صفحہ ۱۵۸ پر رقم فرمایا ہے'' قرآن کریم میں حکم ہے کہ مسلمان جنگ میں کفار کا جو مال غنیمت حاصل کریں' اس کے پانچ حصے کر کے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول کے نام پر الگ نکال دیا جائے جو یتیموں' مسکینوں اور حاجت مندوں وغیرہ میں بانٹ دیا جائے' سوال یہ ہے کہ باقی ۴ حصے کیا کئے جائیں۔ تمام مجاہدین پر برابر بانٹ دیئے جائیں یا فرق کے ساتھ۔'' (اقتباس ختم ہوا)۔ یہ تقسیم قرآن کریم کے واضح احکامات کے خلاف ہے۔ لیکن یہ تفسیر روایات پر مبنی ہے۔ اسی طرح جو حضرات ہر سال کروڑوں روپوں کا خمس ذوی القربیٰ کی مد میں ساداتِ عالی درجات کو دیتے ہیں وہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔ اور اس کی بڑی بڑی رقوم' مذہب کے نام پر رائیگاں جاتی ہیں۔ سادات کو خمس کی رقوم دے کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوتی۔ بلکہ مفسرین کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ قرآن کریم میں ولذی القربیٰ سے مجاہدین اور شہداء کے رشتہ دار مراد ہیں۔ نہ کہ حضور ﷺ کے رشتہ دار' کیونکہ اس آیت کریمہ سے ماقبل و ما بعد کی آیات میں جہاد کا تذکرہ ہے' سادات کا کوئی ذکر نہیں چل رہا ہے' اسی طرح غلام' لونڈی' نکاحِ نابالغاں' ملکیتِ زمین' پیشوائیت' ملوکیت' قرآن کریم کے برخلاف' ان سب کا جواز موجودہ تفاسیر کی بنا پر ہے اور بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم مسلمان زیادہ تر اطاعت خود ساختہ انسانی نظریات کی کرتے ہیں اور تقریباً ۱۰ فیصد اطاعت اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں جس کی پاداش میں قرآن کریم کی آیت کریمہ کے مطابق خزی والحیوۃ الدنیا والاخرۃ میں مبتلا ہیں۔ جب تک خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کی جائے گی مسلمانوں کی حالت کبھی درست نہیں ہوسکتی۔ اور یہی طلوع اسلام کا مقصد ہے اور یہی اس کا دعویٰ ہے کہ مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد' مکمل اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔ اس کے نزدیک ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کر دے۔ کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام ہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کر دے۔ کیونکہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول ﷺ کے باغی اور نافرمان ہیں۔ خواہ وہ کس قدر بھی نماز اور روزہ کے پابند ہوں۔

اس سلسلہ میں مزید چند نقاط پیش خدمت کئے جاتے ہیں اور علماء کرام اور مفکرین قرآن کی خدمت میں درخواست ہے کہ ان نقاط کو دل جمعی سے مطالعہ فرمائیں اور اس کی ایک ایک شق پر غور فرمائیں اور اپنے غور و فکر کو دینی جرائد میں پیش فرمائیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جتنی تفاسیر ہیں' سب ایک دوسرے کے چربے ہیں اور ایک ہی اصول یعنی تفسیر بالروایات کے طریقے پر تحریر کی گئی ہیں۔ ان کی تعداد کی کثرت' اسلاف سے اخلاف تک کا امتداد ان کی صحت کے لئے کوئی دلیل فراہم نہیں کر سکتی۔ ان سب کی طرف سے صرف نظر کرنا' صرف ایک اصول یا صرف ایک تفسیر سے صرف نظر کرنے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس انداز پر تفسیر لکھنے سے فرقہ بندی کو خوب خوب فروغ حاصل ہوا۔ چونکہ ہر فرقہ خواہش مند تھا کہ اپنے عقائد کی سند قرآن کریم سے مہیا کرے' لیکن آیات کے الفاظ ان عقائد کی سند مہیا کرنے سے قاصر تھے۔ اس لئے موضوع روایات کا سہارا لیا گیا اور ہر غیر قرآنی عقیدہ کی سند تفسیر بالروایات سے حاصل کی گئی۔ چونکہ موضوع روایات کی کوئی کمی نہیں تھی اس لئے اس طرح کی تائیدات فراہم کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور اس سے فرقہ بندی میں اضافہ ہوا۔ ہر فرقہ کی تفسیر الگ ہونے لگی۔ ہر فرقہ کی مختلف تفسیر ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایک ذخیرہ تفسیر درست ہے اور باقی سب فرقوں کی تفاسیر غلط ہیں اور غلط روایات سے ان کی تائید حاصل کی گئی ہے۔

۳۔ ساری تفاسیر جس دور میں لکھی جانی شروع ہوئی ہیں اس وقت تک اسلام اپنی اصل اور درست شکل میں نہیں رہا تھا۔ اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے اور ایک دین ہے جس دین کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کے مترادف ہے۔ حضورﷺ نے اس دین کو جاری فرمایا اور خلافت راشدہ کا نظام اسی دین پر مبنی تھا۔ خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت غالب آ گئی اور دین اور ضابطۂ حیات کا تصور آنکھوں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔ ہماری تفاسیر ملوکیت کے دور کی تصنیف کردہ ہیں اور قرآن کریم کو دین کے بجائے مذہب کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔ آج جب کہ انسانی ذہن کے تراشیدہ نظامہائے زندگی ناکام ہو رہے ہیں' اسلام بحیثیت ضابطہ حیات اور دین کے سامنے آ رہا ہے لیکن وہ تفاسیر جو قرآن کو بطور مذہب پیش کر رہی ہیں' اسلام کو بہ حیثیت دین پیش کرنے سے مانع ہو رہی ہیں اور اسلام کو بحیثیت نظام جاری کرنے میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔

۴۔ ان تفاسیر میں شان نزول کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور شان نزول کو پیش نگاہ رکھ کر ہی آیات کی تفسیر کی گئی ہے۔ اس لئے آیات کو مقید اور محدود کر دیا گیا ہے۔ قرآن کریم ایک آفاقی دین پیش کرتا ہے۔ اس کو کسی ملک' خطہ' قوم' یا دور سے مختص نہیں کر سکتے اس کی آفاقیت ہمہ گیر ہے۔ شان نزول کی وجہ سے ان آیات کی آفاقیت ختم ہو جاتی ہے اور آیت کا صرف ایک واقعہ کے ساتھ اختصاص ہو جاتا ہے۔ عقلاً بھی شان نزول کا عقیدہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی منشاء و تدبیر کے مطابق نازل ہوا

ہے۔ اگر بالفرض وہ واقعہ پیش نہ آتا تو کیا وہ آیت نازل نہیں ہوتی۔ یا اگر واقعات زیادہ تعداد میں پیش آجاتے تو کیا اس سے زیادہ آیات کا نزول ہوتا۔ یہ نظریہ عقل کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔

۵۔ آخری بات قابل غور یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو تصریف آیات پر اس قدر زور دیا ہے اور قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے خود بطور ایک اصول متعین فرمایا ہے' اس اصول سے ان تفاسیر میں کوئی مدد نہیں لی گئی اور اس اصول کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ آپ ایک ہزار سال کی تحریر کردہ تفاسیر کو کھنگال ڈالیں' اس اصول کی کوئی رمق آپ کو کہیں نہیں دکھائی دے گی اور اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس طرح تفسیر کرنے سے غیر قرآنی نظریات کی سند بالکل نہیں مل سکتی جن کی سند روایات سے بآسانی مل جاتی ہے اور عملاً یہ صورت ہوئی کہ قرآن کریم بالکل مخفی ہو گیا اور آج جو ہمارے پیش نظر ہے وہ صرف روایات کی تعلیم ہے اور بس۔

مسلمان قوم کو زندگی صرف اس صورت میں مل سکتی ہے کہ اس کے سامنے خالص قرآن ہو اور بحیثیت نظام' دین اور ضابطہ حیات کے اس پر عمل کیا جائے۔

وما ارید ان اخالفکم الی ما انھٰکم عنہ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت ○ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب (۱۱/۸۸)۔

وھٰھنا تم منا الکلام
علی مصطفٰنا الوف سلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہیں آج کیوں ذلیل.....

(شمس العُلماء حافظ سید محبّ الحق مرحوم 1855-1950ء)

سوال یہ ہے کہ جب مسلمان حق پر ہیں تو ایسے برے حال میں کیوں ہیں' یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر۔ یہاں تک کہ ہندوؤں سے بھی ہر چیز میں کہیں فروتر۔

(قبلہ حافظ صاحب کی کتاب دعوت الحق میں ایک طالب آپ سے سوالات پوچھتا ہے اور آپ اس کے جوابات دیتے ہیں۔ وہ اسلام کی حقانیت سے متاثر ہونے کے بعد مندرجہ بالا سوال پوچھتا ہے۔ یعنی حافظ صاحب' طلوع اسلام میں شائع شدہ سوال کو اسی طالب کے سوال کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں۔طلوع اسلام)

ہاں یہ اعتراض صحیح ہے' اس کا جواب ذرا توجہ سے سنئے۔

خدا نے بندوں کا برا حال دیکھ کر پیغمبروں کے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا' ہر قوم میں پیغمبر آئے۔ خدا کا پیغام لائے' یعنی کتاب اللہ لائے۔ اسے قوم کو دیا۔ اور اس پر خود عمل کر کے انہیں بتایا۔ قوم نے ترقی کی۔ مختلف اقوام میں سے ہر ایک قوم کو اصول کے اعتبار سے ایک ہی کتاب مختلف زبانوں میں ملتی رہی تھی۔ ہر کتاب ایک دوسرے کی مصدق۔ کیونکہ ہر ایک کتاب قانون فطرت کے مطابق تھی۔

خدا کی شان سے یہ بہت بعید تھا کہ فطرت تو کچھ اور بناتا اور حکم کچھ اور دیتا۔ سب پیغمبروںؑ کی کتابیں جب ان کی قومیں ضائع کرتی گئیں تو آخر میں ایک پیغمبر ساری دنیا کے لئے آیا۔ چونکہ اس کے بعد کسی اور پیغمبر کی ضرورت نہ تھی اس لئے رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ اب اس کی ضرورت تھی کہ اس کتاب کو جو اللہ نے اس پر وحی کی تھی' محفوظ رکھا جاتا اس کی حفاظت خدا نے اپنے ذمہ لی۔ چنانچہ دیکھ لو۔ وہ اب تک خدا کی حفاظت میں ہے۔ یہی اسلام اگلی کتابوں میں تھا۔ ''یقیناً قرآن پہلی کتابوں میں بھی تھا۔'' (شعراء) چنانچہ تمام کتب سابقہ ایک دوسرے کی مصدق تھیں اور وہ اب قرآن میں آ گئیں اس لئے قرآن ان سب کا مھیمن (محافظ) ٹھہرا۔ اس لئے ہمیں حکم دیا کہ سب پیغمبروں اور ان کی تمام کتابوں پر ایمان لاؤ' قرآن پر ایمان' ان سب پر ایمان کو اپنے اندر لے آتا ہے۔ خدا ایک۔ رسول سب برحق۔ کتابیں سب ایک دوسرے کی مصدق کیونکہ سب فطرت کے مطابق تھیں اور فطرت غیر متغیر ہے۔ لا تبدیل

لخلق اللہ ۔اسی طرح لا تبدیل لکلمت اللہ۔

جس طرح ساری قوموں نے اول اول اصل کتاب اللہ پر عمل کیا اور اس سے دین اور دنیا کی کامیابی حاصل کی ۔ رفتہ رفتہ دنیا کا خیال دین پر غالب آنے لگا تو انہوں نے کتاب اللہ کو ضائع کرنا شروع کر دیا اور اس کی جگہ بنائی ہوئی باتوں پر عمل پیرا ہو گئے ۔ آہستہ آہستہ کتاب اللہ کی جگہ ان ہی باتوں نے لے لی ۔ باتوں کو حدیثیں کہتے ہیں ۔ تورات و انجیل کو اٹھا کر دیکھو ۔ کہیں خدا کا قول نہیں ملے گا ۔ ہر جگہ یہی ملے گا کہ رسول نے یہ کہا ۔ نبی نے یہ فرمایا ۔ یوں ان کی کتابیں ضائع ہو گئیں ۔

مسلمانوں کا جب تک قرآن پر عمل دخل رہا' کامیابی نے پرچم لہرایا ۔ سلطنت نے عروج پکڑا ۔ یہ عروج ایسا محکم تھا کہ قرآن چھوڑنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس کے اثرات باقی رہے ۔ اس کے بعد سلطنت نے دین کو دنیا سے الگ کر دیا ۔ دنیا کا خیال دین پر غالب آیا ۔ اس کے لئے قرآن پیچھے ڈالا گیا اور جس طرح پچھلی امتوں نے حدیثیں بنائی تھیں' انہوں نے بھی یہی کچھ کرنا شروع کر دیا ۔ اب جو جج اور قاضی مقرر ہوتے تھے ان کی تقرری کا معیار' حدیث دانی ہوتا تھا ۔ اب عزت و تکریم قرآن جاننے والوں کے لئے نہیں بلکہ حدیث جاننے والوں کے لئے تھی ۔ موضوعی حدیثوں کا دروازہ کھل گیا ۔ خدا نے حکم دیا تھا فاحکم بینھم بما انزل اللہ (جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلے کرو' اور ''سو ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں آسان کیا ہے تا کہ تو متقیوں کو اسکے ذریعے بشارت دے اور جھگڑالو قوم کو اس کے ذریعے ڈرائے ۔'' (مریم) یعنی فیصلے بھی ماانزل اللہ (قرآن) کے مطابق ہونے تھے اور تبشیر و تنذیر بھی اسی کے ذریعے ۔ لیکن قوم نے کیا کیا ۔ اسے بھی سنئے ۔

خدا کا فرمان تھا کہ اے رسول ان سے کہہ دے کہ ''یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا تھا تا کہ میں تمہیں بھی اس سے ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے ۔'' (انعام) یعنی جو کچھ خدا نے وحی کیا وہ سب قرآن میں تھا ۔ قرآن سے باہر وحی کہیں نہ تھی ۔ لیکن قوم نے کہا کہ یہ غلط ہے ۔ ایک وحی جلی ہے جو قرآن میں ہے اور ایک وحی خفی ہے جو حدیث ہے ۔ خدا نے قرآن کی تبلیغ کا حکم دیا لیکن قوم نے کہا کہ نہیں جبریل (معاذ اللہ) حضورؐ کے کان میں کہہ جاتے تھے کہ جو کچھ قرآن میں وحی کیا گیا ہے وہ غلط ہے ۔ تم یوں حکم دو ۔ مثلاً خدا نے وصیت کا حکم دیا ''للوالدین والاقربون'' جبریل نے کہا کہ یہ دکھلاوے کا حکم ہے ۔ اصل حکم یہ ہے لا وصیۃ لوارث (وارث کے لئے کوئی حکم نہیں) ۔ یعنی خدا نے وصیت کا حکم دیا ۔ اس کی تاکید کی اور جو وصیت نہ کر سکے اس کی طرف سے خود وصیت کر دی (وصیۃ من اللہ) لیکن آیتِ وصیت کو حدیث نے منسوخ کر دیا ۔ اور اسے ترکہ کی آیت فرض کر کے ترکہ کی تقسیم شروع کر دی ۔ اور محجوب وغیرہ کا قصہ کھڑا کر دیا ۔ اسی طرح قرآن نے کہا تھا کہ زنا کی سزا سو دُرے ہیں ۔ لیکن قوم نے حدیث گھڑی اور کہہ دیا کہ زنا کی سزا سنگسار ہے ۔

حالانکہ سنگسار کا حکم قرآن میں کہیں بھی نہیں۔ یہ صریح قرآن کی تحریف اور رسول ﷺ پر اتہام ہے۔ غرضیکہ کہاں تک لکھا جائے۔ قرآن کا کوئی حکم اور کوئی تبشیر و تنذیر نہیں جو حدیث سے متاثر نہ کر دی گئی ہو۔

وحی خفی کو فرض کر کے حدیثوں کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا اور اس طرح آپ کو متہم کر دیا۔ یہ پہلی بدعت تھی جو دین میں داخل کی گئی۔ اسی سے سب فرقے بنے۔ شیعہ، سنی، مقلد، غیر مقلد، شافعی، حنفی، مالکی، حنبلی اور علیٰ ھذا کس قدر فرقے نکلنے شروع ہو گئے۔ یہ سب فرقے حدیث کی وجہ سے نکلے اور مسلمان شرکوں میں داخل ہو گئے، کہ قرآن کا حکم ہے کہ

ولا تکونوا من المشرکین۔ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون۔

''دیکھنا! تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ پھر حالت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ اپنے مسلک پر مگن ہو کر بیٹھ گیا۔

یوں آخری اسلام میں بھی پھوٹ پڑ گئی اور پھوٹ خدا کا عذاب ہے۔ ''خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ یا ایسا کرے کہ تم گروہ گروہ ہو کر آپس میں لڑ پڑو اور ایک (گروہ) دوسرے (گروہ) کی شدت کا مزہ چکھے'' (انعام)

مسلمانوں نے اس پھوٹ کا خوب مزہ چکھا ہے اور بغداد کی تباہی کے بعد یہ عذاب شدید ترین شکل میں ان پر مسلط ہو چکا ہے۔ یہ ہے راز مسلمانوں کی تباہی کا۔ قرآن سے منہ موڑ کر اگر ذلیل نہ ہوتے تو اور کیا ہوتا۔ انہوں نے قرآن کو چھوڑا تو باقی رسومات رہ گئیں۔ انہوں نے کہا کہ رسومات کو محکم طور پر قائم رکھو۔ بس یہی مذہب ہے۔ فقط اتنا یاد رکھو کہ فلاں چیز سنت ہے۔ فلاں مکروہ ہے۔ فلاں واجب ہے۔ قرآن ان اصطلاحوں سے بے نیاز ہے۔ قرآن میں جس چیز کے کرنے کا حکم ہے وہ فرض ہے اور بس۔ قرآن اصطلاحات سکھانے اور رسومات کا پابند بنانے نہیں آیا تھا۔ وہ آیا تھا مسلمانوں میں جذبۂ جہاد بیدار کرنے کے لئے۔ قل ان کان اٰبائکم وابناء کم..... قوم الفاسقین (توبہ) ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان کے لوگ اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے پر تم ڈرتے ہو اور مکان جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا''

مسلمان جب تک قرآن کے متبع تھے، جہاد ان کے نزدیک سب سے بڑا فریضہ تھا۔ جب جہاد سے دل چرانے لگے تو پھر قرآن کے بجائے حدیثیں جمع کرنی شروع کر دیں جن میں ذرا ذرا سی بات پر ثواب کے پہاڑ مل جانے کی ''بشارتیں'' لکھ دی گئیں۔ خدا نے قرآن کے متعلق فرمایا تھا کہ ''اسی

قرآن سے زندگی کی شادمانیاں حاصل کرو۔ یہ ان چیزوں سے بہتر ہے جنہیں تم جمع کرتے پھرتے ہو' لوگوں نے اس کو یوں مذبوح کہا کہ قرآن ان خزانوں سے بہتر ہے جنہیں تم جمع کرتے ہو۔ لیکن تقابل ہمیشہ ہم جنس میں ہوتا ہے۔ اگر میں کہوں کہ چاند تارے میری کتاب سے بہتر ہیں تو یہ بات بے معنی ہو گی۔ لوگوں نے حدیثیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس کو خدا نے منع فرمایا۔ اور خدا کے رسولؐ نے بھی منع فرمایا اور صاف کہہ دیا کہ لا تکتبوا عنی سوی القراٰن ومن کتب عنی شیئاً فلیمھا۔ (مجھ سے قرآن کے سوا اور کچھ نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ اور لکھ لیا ہے اسے مٹا ڈالے) اسی کے اتباع میں خلیفہ اولؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم ان قوموں کو جانتے ہو جنہوں نے حدیثیں جمع کرنا شروع کر دیں اور کتاب اللہ کو ضائع کر دیا۔ دیکھو تورات اور انجیل اس پر شاہد ہیں۔ اسی کی تعمیل میں خلیفہ ثانیؓ نے فرمایا کہ حسبنا کتاب اللہ (ہمارے اللہ کی کتاب کافی ہے) اور حدیثیں بیان کرنے والوں کو مجرم قرار دیا اور جلا وطن اور نظر بند کر دیا۔ مگر آخر میں زمانہ بدل گیا۔ بادشاہوں کی سطوت رنگ لائی۔ حدیث کو رسول ﷺ کے نام کے ساتھ منسوب کر کے بدعت قائم کی اور اسے قرآن میں ضم کر دیا۔ بلکہ قرآن پر حکم قرار دے دیا۔ اب مولوی۔ مشائخ۔ امام بننے شروع ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ ' حضرت عمرؓ ' حضرت عثمانؓ ' حضرت علیؓ میں سے نہ کوئی مولوی تھا نہ مولانا۔ نہ امام نہ کچھ اور وہ سب مومن تھے اور خدا کے بندے۔ خدا کا حکم تھا کہ اتبع ما اوحی الیک من ربک (اے رسول جو کچھ تم پر خدا کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے اس کی اتباع کرو)۔ آپ نے کما حقہٗ قرآن کی تعمیل فرمائی جس کی خود خدا نے شہادت دی۔ قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی (ان سے کہہ دو کہ میں صرف اس کی اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی ہوتی ہے)۔ یعنی رسول اللہ نے منادی کر دی کہ میرا عمل قرآن کے سوا اور کسی چیز پر نہیں ہے اس سے واضح ہے کہ جس چیز کو قرآن نے فرض قرار دیا ہے وہی رسول اللہ کی سنت تھی۔ سنت اور فرض دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ قرآنی فرائض کے علاوہ سنت اور کچھ نہیں کہ رسول ﷺ نے قرآن ہی پر عمل کیا تھا اور عملِ رسول ﷺ کو سنت کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے کہہ دیا کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (یعنی چونکہ رسول قرآن پر عمل کرتا ہے اس لئے جس نے رسول کی اتباع کی اس نے خدا کی اطاعت کی)۔ بات بالکل صاف ہے قرآن سے باہر سنت کی تلاش کے یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) زبان سے تو یہ کہتے تھے کہ میں صرف قرآن کی اتباع کرتا ہوں (انما اتبع ما یوحیٰ الیٰ من ربی) اور عملاً قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی اتباع کرتے تھے جسے اب قرآن سے باہر سنت کہا جاتا ہے۔

ہمارا لکھنا آپ صاحبوں کو برا معلوم ہو گا۔ لیکن میں اب اگلی منزل سے بہت قریب ہوں اس لئے میں نے جو کچھ حق سمجھا اسے کھلے الفاظ میں کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ لوگوں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے اور خدا کو ایک

دم بھول چکے ہو۔ میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اللہ اللہ ہے اور لا یشرك فی حکمه احداً (وہ اپنے حکم میں کسی اور کو شریک نہیں کیا کرتا)۔ آپ خدا کو کافی سمجھئے پھر دیکھئے کہ خدا آپ پر ویسا ہی مہربان ہو جائے گا جیسا پہلے تھا۔ اپنے بدعتی خیالات سے دین کو خالص کرو الا للہ الدین الخالص (دین خالص صرف اللہ کے لئے ہے)۔ بس دین خالص میں (جو قرآن کے اندر ہے) مسلمانوں کی تمام فلاح و بہبود مضمر ہے۔ جس دین میں بدعت کی آمیزش ہو جائے وہ دین خالص نہیں رہا کرتا اور ''ملے جلے دین'' کا نتیجہ (جسے خدا شرک قرار دیتا ہے) ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک جی چاہے اسے آزما لو۔ یہ اللہ کا قانون ہے جو نہ پہلی امتوں کے لئے بدلا ہے نہ تمہارے لئے بدلے گا۔ مسلمانو! ایک مرتبہ پھر کہو کہ

حسبی اللہ۔ نعم المولیٰ و نعم النصیر

میرے لئے اللہ کافی ہے۔ وہی بہترین آقا ہے اور وہی بہترین مددگار۔

پھر اس کے بعد دیکھو کہ اس کی ولایت اور نصرت کفایت کرتی ہے یا نہیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

MAN AND WAR

By
(G.A. Parwez)

We are reproducing G.A. Parwez's chapter on "Man and War" (from his book "Islam—A Challenge to Religion") at a time when our Planet Earth is threatened in the coming moments with war and violence which could easily lead to the Third World War. What with deathly inventions and accumulation of nuclear weapons stucked in so many areas, it could mean total annihilation of the Planet Earth.

G.A. Parwez's essay, based on the Quranic text, points out glaring contradictions in Man in being both highly creative and constructive on the one hand, and being ever so lowly, destructive at the same time. He keeps on destroying what he creates.

The emphasis of the Quran is on JUSTICE. Peace or War, it must be based on JUSTICE. In other worlds JUSTICE is the key word to life. Any deviation from it means disintegration.

G.A. Parwez has comprehensively and beautifully described the above theme and I leave it to the readers to appreciate and enjoy its erudite text.

However, there is one aspect that has been intriguing me regarding political leaders and their close compatriots. History tells us that it is at this level that a large-scale destruction takes place. It occurred to me that if civil and military services go through a psychological test by a Board of Psychologists, then why not the political leadership and their close associates? How many Abraham Lincolns, Jinnahs and Mao's have we acquired? We have had more of Changes Khan's, Hitler's, Stalin's, and Bushes. If we go further on the issue, a universal law should be enacted that every prospective worried couple should also go through a psychological test, and only those found psychologically acceptable should be allowed to bear children.

All this may sound rather farfetched, but it is an issue worth considering by the world leadership in all areas, if the Planet Earth and the Human Race is to Survive.

(Idara)

I. The Distant Past

HUMAN characteristics are baffling in their complexity and contradictions. Man's capacity for ennoblement is equaled only by his capacity for debasement. He can rise to heights of sublimity but also sinks to the lowest depths of degradation. He may adore God with a fervour which is truly angelical; on the other hand, he may take devilish delight in debauchery and sensuality. If he can rise to heights of spiritual grandeur in love and can even die for his beloved, he can also hate like a beast of the jungle. Endowed with an intelligence which can explore interstellar spaces and can weigh the sun and the earth, he may remain ignorant of his own worth and latent

powers and foolishly follow a path that will surely lead to the extermination of the human race.

War has been with man throughout his existence on this planet. As far as our eye can penetrate the haze of the distant past, we see men fighting each other. Despite the splendid civilisation he has created, and despite his glorious achievements in art and science, one wonders whether a being so busy with destroying his kind deserves to be called human. It is true that from time to time great men have appeared who have held aloft the banner of peace, tolerance and fellowship, but equally prominent men have as often preached the opposite gospel and glorified war. To Nietzsche, fighting was a noble occupation. "Men should be educated for war," he counselled, "and women for the production of warriors," and adds, to make his meaning clear, "every-thing else is folly." Mussolini looked upon war as a moral necessity. Hitler regarded war as the basic principle of life. For him law was only that which a soldier laid down. In his view, only those who help the state to prepare for war really contribute to national culture and social well-being. "We should demolish," says Heinrich Hauser, "all those institutions which safeguard peace and security for man. Life will be stable and simple only in an age we call barbaric."

Although such extreme views are now generally despised and ridiculed, there are still many influential persons today who would not hesitate to plunge the world in war to settle an international dispute: fortunately they are restrained by the sober men in every country. They are also deterred by the prospect of nuclear war which would spell the annihilation of the victor and vanquished alike.

It is a fact that the menace of war has not receded from the present world. The policy of brinkmanship practiced by some heads of states poses a threat to man-kind. It is strange that modern man who aspires to colonise the moon and other planets cannot solve the problems that confront him on earth.

Let us see whether the Qur'an can help us in this predicament. Does it offer any effective remedy for our social malaise? If so, how can the remedy be applied? The Qur'an ascribes two significant attributes to God—*As-Salam* and *Al-Mu'min*. *As-Salam* is the Being Who is the source of peace and concord and who assures peaceful existence to all beings. *Al-Mu'min* is the Being Who shelters and protects all and bestows peace in every sphere of life on all beings. Moreover, the way of life which the Qur'an prescribes for us is called Islam, which basically means peace.

The *Mu'min* is the man whose life exemplifies peace. The Qur'an refers to itself as the means by which the paths of peace are made wider (5:16). It summons men to the "house of peace" (10:25). The reward for living in accordance with its tenets is "the abode of peace" (6:128). Peace reigns in the society of *Mu'mins.* When they depart from this world, the *malaikah* receive them with the salutation: "Because of the steadfastness with which you worked on earth in the cause of peace, there is for you

here a reward of peace and safety" (13:24). An ardent desire for peace is reflected in the words in which one Muslim greets another. "Peace be on you" he says to his friend, and receives the joyful answer, "and peace be on you too". The Qur'an applies the term *fasad* to any disturbance of social peace. It is hateful to God (2:205). God commands men not to cause dissension or commit violence in the world (7:56). Of the believers it is said that they do not breed mischief and violence (28:83).

It is thus clear that Islam is a staunch supporter of peace and that mischief and violence, in any form, are repugnant to it. It seeks to establish universal peace and to assure security to all peace-loving people.

It is not doubt true that human beings, by and large, wish to live in peace. Nevertheless, the outbreak of violence is by no means a rare phenomenon. The Qur'an offers us sensible advice on how we can check violence when it breaks out. If an individual disturbs the peace we can try persuasion and if it fails, the government will have to intervene and restrain him by force. However, the problem is much more difficult when a nation commits aggression against another nation.

II. Christianity and War

Christianity favours the policy of non-resistance to evil. We are advised by it not to return evil for evil, not to meet violence with violence. The New Testament tells us that the proper answer to an act of violence is an act of love:

> Ye have heard that it hath been said,
> An eye for an eye, and a tooth for a tooth:
> But I say unto you, that ye resist not evil: but whosoever shall smite thee on thy right cheek, turn to him the other also.
> And if any man will sue thee at the law, and take away thy coat, let him have thy cloke also.
> And whosoever shall compel thee to go a mile, go with him twain (St. Mathew, 5:38-41).

To do good in return for evil is said to be the best way to fight evil. No doubt, these are noble sentiments and in the personal lives of individuals may be praiseworthy. But it is doubtful if Jesus (P) could have taught these precepts for universal behaviour; for experience does not prove their wisdom. They hold good in rare instances only, and *Anbiya* do not speak for rare exceptions. The history of Christianity too negates their authenticity. Dean Inge's comment on this way of combating evil deserves careful consideration:

> The principle of non-resistance was laid down for a little flock in a hostile environment. But an organised society cannot abstain from the use of coercion. No one would suggest that a Christian Government must not suppress a gang of criminals within its own borders, and if this is admitted, can we doubt that it should defend itself against an invading enemy? … Augustine held that war is justified in repelling wanton and rapacious attacks and that in preventing such crimes we are acting in the true interest of the aggressor. Without justice what is empire but brigandage on a large scale… Allowing that circumstances may arise which make a defensive

war inevitable we have found a principle which will guide us in concrete cases.[1]

Even in the New Testament, as it exists today, there are statements here and there which are clearly at variance with the creed of non-violence and absolute non-resistance to evil. For example Christ (P) is reported as saying:

> Think not that I am come to send peace on earth: I came not to send peace, but a sword.
> For I am come to set a man at variance against his father, and the daughter against her mother, and the daughter in law against her mother in law (St. Mathew, 10:34-35).

It is obvious that the use of force to defend a good cause is not ruled out in Christianity.

In our own time, "Mahatma" Gandhi of India was believed to be a staunch and uncompromising supporter of the creed of non-violence. He too, had to tone down his idealism and adopt a more realistic attitude to evil:

> If an open warfare were a possibility, I may concede that we may tread the path of violence that the other countries have, and at best evolve the qualities that bravery on the battlefield brings forth.[2]

This apostle of *ahimsa* even goes so far as to admit that when the need arises, not only men but also women will have to resort to violence and meet force with force.[3] It is needless to add that the followers of this *rishi* have resorted to violence whenever it suited their purpose.

III. Qur'an and War

The Qur'an never appeals to the passing emotions of man nor does it stoop to humour him. It faces the problems of life in a realistic manner and offers practical solutions for them. Like the New Testament, it advises us to do good in return for evil, for such actions are likely to have a wholesome effect on the evil-doer. Our moral worth, too, will be enhanced thereby:

> Return a bad act by one that is beautiful and good. It may be that he, between whom and you there is enmity, becomes your bosom friend (41:34).

In another place, a *mu'min* is described as "one who repels wrong with right" (28:54). But if the enemy takes mean advantage of such goodness, the Qur'an permits the use of force, provided it is in accordance with the requirements of justice. While permitting force in such cases, the Qur'an advises us to be lenient towards the man who has wronged us. If he repents, he is to be forgiven. The Qur'an exhorts us to forgive our enemies and those who have wronged us:

> But he who forgives and makes peace (with his adversary), his reward devolves upon God (42:40).

The Qur'an applies the term *"zalim"* (cruel, oppressive) to those who do not forgive

---

[1] Dean Inge, *The Fall of Idols,* pp. 176-179; 177; 181.
[2] *The Young India,* p. 147, (quoted by Fatima Mansur in *Process of Independence,* p. 44).
[3] *Harijan,* dated 27 October 1946.

their enemies. In another place, however, the Qur'an concedes to man the right to demand that his enemy should make amends for the wrong he had done and failing that he should be punished. Those who are unjust and cruel to their fellow-beings are denounced by the Qur'an, however, inculcates in man that it is a noble thing to forgive. It asks us to forgive the man who has done us injury, whenever we have grounds for believing that such forgiveness will do good to the wrong doer as well as to society.

IV. Law and the Use of Force

The mere enactment of good laws, the Qur'an asserts, is not enough to ensure peace in the world. It is necessary that the laws should be properly enforced:

> We sent Our messengers with clear arguments and with these Our laws and the criterion of justice so that man may establish himself in justice; and with it We have also created steel wherein is mighty power and many other uses for mankind (57:25).

In other words, law which is not backed by force is no more than pious advice. Law must be enforced if the social order is to be maintained. The Qur'an, therefore, is in favour of the state maintaining sufficient power to enforce its laws. If the Qur'an calls God *As-Salam,* the source of peace, it also applies to Him the terms, Protector, the Mighty, the Compeller, and the Self-reliant. The state should reflect these attributes as well.

The power vested in the state should be used to maintain law and order and as a defense against those who threaten its independence. The state is not to use its powers to curtail the freedom of individual. The purpose for which the state exists is to maintain conditions in which the individual can develop and achieve self-realization. This purpose is fulfilled only when the state is fully independent and prepared to meet aggression from any quarter:

> Make ready for your opponents all you can of armed forces and of horses tethered, that thereby you may dismay the enemy of Allah and your enemy and others beside them whom you know not (8:60).

The state should not use its power to oppress the weaker nations. It should use its power to create conditions in which the way of life ordained by God can be followed. The first battle fought by the Muslims exemplifies the right use of force.

The *Rasul* and a small band of his devoted followers lived in Mecca for thirteen years. During this time they suffered all kinds of persecution with patience and humility. Every insult or act of violence was received in silence or at the most it evoked a gentle protest. But their self-imposed restraint was mistaken for weakness and every day they suffered outrages. When oppression became intolerable, they left their ancestral home and sought refuge in Madina, a town several hundred miles away from Mecca. Even here they were not left in peace. Their enemies were determined to compel them to renounce the new creed or to exterminate them if they refused to do so. A formidable force-marched against them. For the refugees it was a question of life and

death. Even then they hesitated to meet force with force. They patiently waited for Divine guidance, that they might do which was right. They were at last permitted to resort to force and give battle to their implacable enemies:

> And whoso defendeth himself after he hath suffered wrong… for such there is no way of blame against them (42:41).

A clear directive is given in the following verses:

> Permission is given to those who are fought against (to fight) for that they have been wronged; and verily God has the power to help them:
> Those who have been driven from their homes unjustly only because they said: "our *Rabb* is Allah." For had it not been for Allah's repelling some men by means of others, cloisters and churches and synagogues and (all other) places of worship, wherein the name of God is oft mentioned would assuredly have been pulled down. And God will certainly help him who helps Him. Verily Allah is strong, mighty (22:39-40).

We can conclude from these verses that only those who are persecuted and are not allowed to live in peace are justified in having recourse to war. The question arises, what are they to do if they do not possess the means to defend themselves? In such a case, the Qur'an commands all righteous men to hasten to their rescue and fight on their behalf:

> How should ye not fight for the cause of Allah and of the feeble among men and of the women and the children who are crying: "Our *Rabb!* Bring us forth from out of this town whose people are oppressors. Oh, give us from before Thee some protecting friend! Oh, give us from before Thee some defender!"
> Those who believe do battle for the cause of Allah, and those who disbelieve do battle for the cause of *Taghut.* So fight the minions of *Shaitan.* Lo! The *Shaitan's* strategy is ever weak (4:75-76).

The meaning is clear. Oppressed people, all over the world pray for a helper to rescue them, for a defender to fight for them. Do you not hear the cry of the oppressed? Or, do you think that, being secure yourself, there is no need for you to fight? You are wrong. It is your duty to hasten to the help of all who are groaning under oppression. It is your duty to fight against cruelty and injustice, even if the victims do not profess the values and concepts you profess and do not belong to your country or race. From wheresoever comes the cry of the oppressed, thither you should hasten and fight against the oppressor. This is what war "in the name of Allah" means.

The *Mu'mins* fight in the cause of Allah against cruelty, tyranny and injustice. Their purpose is to make justice prevail in the world. The unbelievers fight to subdue other people and exploit them for their own ends. The Qur'an tells us in simple and direct language when war is justified and when it is not. The principles laid down by the Qur'an are clear and definite. They are not couched in language which may be susceptible to different interpretations. The distinction between a just and an unjust war is clear and should not be blurred by sophistical arguments. For example, people, if they are really persecuted, have a right to rebel against the government of their country.

However, they would be acting directly against the Qur'anic principles if they magnified any petty grievance and called it persecution. They may be said to be the victims of persecution only if the basic rights, defined by the Qur'an, are denied to them. The *Mu'min* will take up arms only to defend these rights, and he will hasten to help the oppressed, whether Muslim or non-Muslim.

V. Rules of Conduct

So far about the conditions under which war is permissible. Let us now consider the rules of conduct laid down by the Qur'an for Muslims when they are at war. In the first place the duty to be just in one's dealings with others is as binding in war as it is in peace:

> O you who believe! Be steadfast witnesses for Allah in equity, and let not enmity of any people seduce you that ye deal not justly. Deal justly, that is nearer to your duty. Observe your duty to Allah, Lo! Allah is well informed of what ye do (5:8).

We should be just even to our enemies. The Qur'an does not permit us to deviate from the path of justice in any circumstances. If an oppressor has deprived human beings of their basic rights, justice demands that those rights should be restored to them. As far as possible, it should be done by peaceful means. Only when these fail, recourse may be had to war. But even in war, we should respect the basic rights of the enemy. When the enemies have been vanquished they should be treated with consideration as human beings.

Secondly, the Qur'an emphatically declares that a treaty ought to be honoured always, in war as well as in peace. The peace of the world depends, above all things, on the trust placed in treaties. A treaty has value only as long as there is mutual trust. Can it command any respect if either of the parties subscribe to the view that all is fair in war? The stronger party could repudiate it whenever it suited its purpose. That is why Solon says that a treaty is a spider's web which entangles him who is weaker than it, and it is not worth a straw for one who is stronger.

Machiavelli stoutly defended unscrupulous dealings in politics. He advises the ruler, in plain terms, to break his faith whenever it suits his purpose:

> A prudent ruler ought not to keep faith when by so doing it would be against his interest and when the reasons which made him bind himself no longer exist.[4]

His disciple, Frederick II, believed that:

> Policy consists rather in profiting by favourable conjunctures than by preparing them in advance. This is why I counsel you not to make treaties depending upon uncertain events, and to keep your hands free.[5]

Long before Machiavelli, a political thinker in India had set forth similar doctrines. The

---

[4] N. Machiavelli, *The Prince,* p. 64.
[5] Quoted by J.M. Murray, op. cit., p. 212.

appellation *Kautilya* (cunning) which was applied to him shows that he defended the use of craft in politics. He believed that only a crafty and unscrupulous man can play the game of politics successfully. In his *Arthashastra,* he writes to the effect that treaties have no sanctity and can be twisted or broken according to the necessity of the moment. However, he counsels the ruler to do this with such cunning that neither his own people nor his opponents suspect him of violating the treaty.

In direct opposition to this glorification of expediency, the Qur'an categorically asserts:

> Fulfill your bonds (5:1).

It reminds us that we are not only answerable to those to whom we have pledged our word, but also to Allah. Allah commands that we should keep our pledges:

> Fulfill your pledges: Remember, you will be asked about your pledges (17:34).

What, however, is to be done if the other party breaks the treaty? The common view is that in such a case, the treaty automatically becomes null and void. Not so with the Qur'an. It deprecates a hasty act and counsels us to appeal to the enemy to reconsider their decision and honour the treaty. Only when this appeal has proved to be vain and the enemy persists in violating the treaty are we justified in regarding it as no longer binding on us:

> If you fear treachery anyway at the hands of a people then throw back to them (their treaty) fairly and thus dissolve it with them equally: Surely Allah loves not the treacherous (8:58).

In the early days of Islam, when the Qur'anic law was invariably obeyed, the violation of treaty by Muslims was unthinkable. Even if the pledge was given by an individual Muslim, it was invariably honoured. An incident which occurred during the battle of Badr illustrates the attitude of the *Rasul* to the pledged word of a Muslim. At this battle, three hundred and thirteen Muslims were opposed by a strong force of over a thousand men. The odds were against them and they would have welcomed any addition to their number. When the fighting was going on and the issue was still uncertain, two armed men suddenly appeared and joined battle on their behalf. The *Rasul* enquired of them, how they had managed to pass through the enemy's land. They replied that they had tried to stop them, but were allowed to go on after pledging their word that they would not take up arms against them. The *Rasul* said that the pledged word must be honoured. He commanded them not to fight, saying that the issue of the battle will be settled according to the Laws of God. Even at this critical juncture he did not allow his men to break their promise.

A piquant situation arose when some pagan women embraced Islam but their husbands remained faithful to the old faith. The husbands began to persecute their wives to compel them to renounce Islam. Some of these women sought refuge in Medina. The Muslims were asked to return the wives to their lawful husbands. The Islamic Law does not sanction the marriage of a Muslim woman to a pagan. Therefore,

the women were told that they were free and would not be forced to return to their husbands. But their husbands were repaid whatever money they had given to their wives or spent on them (60:10). Be it noted that these men were the sworn enemies of Islam and were bent on destroying the little band of Muslims. Even from these enemies the *Rasul* would not withhold what was in justice due to them. This zeal for justice and fair dealing could not but impress the opponents of Islam.

Finally, if the enemies offer peace, in no case should such an offer be rejected. It may be that the Muslims have just grounds for suspecting the motives of the enemy but their suspicions should not prevent them from accepting the offer of peace. It may be that offer is made when victory is within the reach of the Muslims. Even then they should not continue war but should lay down arms and start negotiations for concluding peace. If the enemy has been forced to sue for peace, the purpose of the war has been fulfilled. The purpose was not to subjugate the enemy or seize their territory, but to repel the attack. If, for whatever reason, the enemy shows willingness to lay down arms, the Muslims should do likewise. The enemies may have made the offer of peace merely to gain time or to mask some nefarious design. Even so, the Muslims are commanded to place their trust in God and accept it in good faith, "for God is sufficient for you. He it is Who supports you with His help and with the believers" (8:62). All necessary precautions, however, should be taken and the enemy made to vacate his aggression, but the offer should not be spurned merely on suspicion of ulterior motives.

How long should the war be continued if the enemies refuse to come to terms? The Qur'an enjoins the Muslims to continue the war till the purpose for which it was undertaken is fulfilled. When the purpose has been accomplished, the war should be ended forthwith. Unwar-ranted aggression, persecution of a religious group, oppression and the denial of human rights are some of the reasons which justify war.

If the war cannot be ended but the belligerents can agree to a temporary cessation of hostilities, the opportunity should immediately be seized. During the pause in fighting, tempers may be calmed, passions cooled and sober thinking and heart-searching may create the atmosphere in which an amicable settlement of the dispute may be possible. Nowadays, the term cease-fire is applied to such temporary arrangements. This method of terminating a war was recommended by the Qur'an fourteen centuries ago. Another step in the same direction was to establish an international convention to the effect that fighting should be forbidden during certain months (9:36).

VI. Prisoners of War

The Qur'an enjoins humane and compassionate treatment of prisoners of war. In those days in Arabia as elsewhere, prisoners of war were usually made bond-slaves. Men and women taken in war were sold as slaves. Nowhere was this practice regarded

as objectionable. The Qur'an with its insistence on the worth of the human self, could not sanction such an outrage on human dignity. It commanded Muslims to adopt other ways of dealing with prisoners of war. The directive given was:

> Now when you meet in battle your opponents then it is smiting of the necks until you have routed them; then bind fast the bonds; then either give them a free dismissal afterwards or exact a ransom (47:4).

The meaning of the verse is quite clear. Prisoners of war may be exchanged for Muslims who are in the hands of the enemy, or they may be set free when the ransom fixed for them has been paid, or they may be set free unconditionally as a friendly gesture to the enemy, or on purely humanitarian grounds. Whichever alternative is adopted, the result is the same i.e., the prisoners regain their freedom. In the whole of the Qur'an this is the only verse concerning prisoners of war. Neither here nor elsewhere is there any hint of making them slaves. The Qur'an, which directs the believers to expiate their faults for even a trivial mishap by emancipating a slave (90:13), which permits the waging of war for defending human rights, and which has proclaimed the equality of men, could not possibly sanction slavery in any form. On the contrary, it commands that prisoners should be treated as guests as long as they remain in the custody of the Muslims. Abu Aziz was one of those who were taken prisoners at the battle of Badr. After his release, he returned to his people and told them about the treatment he had received. "I was billeted on an Ansar. He used to give me bread and other good things to eat while he himself and his family subsisted on dates. I felt ashamed and often gave back the bread to him. He refused to touch it and forced me to eat it."

Another man who fell into the hands of the Muslims at Badr, was Sohail Bin 'Umar. Sohail was a famous orator and had delivered many orations denouncing and vilifying the *Rasul*. The Muslims naturally wished to punish him and somebody suggested that two of his front teeth be knocked out. The *Rasul*, however, did not give his consent to this proposal and Sohail was not touched.

Some of the prisoners taken at Badr were set free after they paid the ransom. There were many who were too poor to pay the ransom. Of these, those who were literate were told that each could buy his freedom by teaching ten Muslim boys. The remaining were set free unconditionally. Those who had paid their ransom were told that if at any time in future they came over to the side of the Muslims, the money they had paid would be refunded to them:

> O Rasul! Say to those captives who are in your hands: If Allah knows any good in your hearts, He will give you better than that which has been taken from you; and will protect you (8:70).

It should be noted that whenever the words "bond-men" or "bond-maids" occur in the Qur'an, they always refer to those who were already there in Arab society. They are spoken of in the past tense. Nowhere does the Qur'an say: "Make your enemies slaves and such are the rules concerning them." When Muslims rose to power, they

gradually emancipated whatever slaves there were in Arab society, and closed the door of slavery for the future.

Men belonging to the enemy camp would now and then seek refuge in the Muslim town. The Qur'an commanded the Muslims not to turn them back. They should be given an asylum and during their stay the Qur'anic teaching should be expounded to them. They were, however, free to accept or reject it. If they decided to return to their people, they should not only be permitted to do so but also an escort should be provided for them so that they could reach their town in safety:

> And if any one of your opponents seeks your protection, then protect him so that he may hear the word of Allah and then escort him to his place of safety (9:6).

It is certainly the duty of the Muslims to enlighten these men on the aim and objective of Islam: but the Qur'an expressly forbids the Muslims to coerce them to accept the Islamic faith.

VII. Is the Abolition of War Impossible?

Human history presents a cheqered pattern of periods of peace alternating with periods of war. Will the same pattern be continued or is permanent peace attainable in the foreseeable future? We can answer these questions with the help of the Qur'an. The verse dealing with the prisoners of war goes on to say that, "war will go on until it lays down its burdens" (47:4). In other words, the motives that lead to war are not rooted in man. They arise in a certain type of social organization and will disappear if the social order is radically changed. The society we have built up is a competitive and acquisitive society. If it is supplanted by the Qur'anic social order, which encourages creative activity and competition in social service, war will cease to be a factor in human affairs. There will be peace all over the world. The Qur'an seeks to weld the races of man into a single harmonious universal society. All national and group rivalries will, therefore, disappear. In such a social order, individuals as well as groups would cease to compete with each other of the prize of power, the power that might enable them to exploit others. They would have learnt to desire something nobler which would unite them instead of dividing them. They would desire self-development through serving others and working for the common good-- the progress of humanity. This social order would provide man with the things he needs most—security, freedom and opportunity for self-expression and self-development. There will be nothing in it to arouse envy, jealousy, greed or malevolence in the heart of man. There will be no clash of interests and therefore, no conflict. Then, in the words of the Qur'an, "War will lay down its burdens," i.e., the function it has so far performed will not be needed in the new order.

As things are, however, it may sometimes be necessary to wage a war in the cause of justice. The *Rasul* is reported to have said, "The purpose of war is to force the oppressor to bow before that which is just" *(Tirmidhi).* Bukhari, the compiler of the

traditions of the *Rasul,* reports that once a question was put to the latter, "One man goes to war for the sake of fame, another to prove his courage and yet another for personal revenge. Of these, whose motive can we approve of?" The *Rasul* replied, "He who rights that the law of Allah reign supreme, his war is for Allah."

Man-made laws merely safeguard the interests of a particular group. Such laws will not be acceptable to other groups: but God is the *Rabb* of all mankind. His Laws protect the interests of each and all men. His laws, consequently, provide a secure foundation for the world peace. In Islam this foundation is called *"Tauhid."* i.e., Oneness. *Tauhid* signifies One set of Laws of the One God for the One Creation—mankind. The social order which is based on this foundation is *din* and is *one* for all humanity.

This truth is beginning to dawn on the minds of Western thinkers. If full realization does not come to them, the fault will lie with the Muslims who received the Divine Law fourteen centuries ago and have not yet expounded it and interpreted it to mankind. The Muslims should bear in mind that the scientific outlook has sunk deep into the modern mind and the modern man speaks the language of science. The Qur'an says: "Mankind is one community" (2:213). It is far easier for modern man to understand this truth than it was for his forebears fourteen centuries ago. Man can come into his own only as a member of a universal brotherhood. The Qur'an sought to establish such a brotherhood, and did establish it within the domain in which Qur'anic laws prevailed. Its message is not for any group but for all humanity. Each of the *Anbiya* who preceded Muhammad (P) appealed to a particular group. Muhammad (P) alone was the bearer of a message for mankind as a whole:

> O Mankind! I am the messenger of Allah to you all, the messenger of Him unto Whom belongeth the sovereignty of the heavens and the earth. There is no Sovereign Authority save Him (7:158).

It is, therefore, the duty of all peace-loving inhabitants of this earth to rally to the Qur'an and march forward under its banner. The dream of perpetual peace will then become a fact:

> O Mankind! There hath come unto you an exhortation from your *Rabb*, a balm for that which is in the breasts, a guidance and *Rahmah* for believers (10:57).

About this social order the Qur'an says:

> He who enters it, is safe (3:96).

Men all over the world should address themselves to the task of building up this social order, in which rests the hope of humanity.

* * * * * * * * * *

LOGIC AND BLIND FAITH

By

A Rashid Samnakay

==========

As a process of increased awareness of the Muslim youth today, mainly due to the events and the highly charged environment around them, there is a debate raging amongst them about:

1 The Religious corpus as an **article of faith** vis a vis Quran

2 The **credibility** or otherwise of this Corpus

Because this debate has elements of querulous fractions in the community and has pitched the 'for and against' parties at each others throats as never before, one has to take part in the debate, for no document, religious or otherwise is immune to the scrutiny and critical examination if one is to evaluate its credibility. The documents must be examined rationally and without fear or else it becomes a blind faith, for that is what Quran itself teaches us (68-36etc). This debate shows that;

1. The subject of 'Traditions' has over the centuries driven an irreconcilable wedge between the 'for and against' proponents.
2. Often the inappropriate tidings and lessons are imparted to the gullible and the innocent but who, never the less are simple people of faith.

The first one above is intolerable, as disunity to the point of rancour and enmity destroys any community and the second is ethically immoral as it takes advantage of the simple folk. The following example taken from a reputed Hadis (tradition) would help to demonstrate one such tiding: -

Synopsis

It is widely believed, as a result of the traditions that are spread through the centuries, that Muhammad Rasullah, during his mission of *messenger-hood,* was so poor that he would tie a rock to his belly in order to suppress the pangs of hunger!

Besides the questionable *logic* of the efficacy of tying the stone to ones belly for the alleged purpose, this story is in complete contrast to a) *History* and b) the verses of *Quraan*, which paint a different picture of the Rasul's material situation all together. Any one with common sense should analyse the story on the basis of logic, as the application of logic is mandated by Quran, which is at least, universally accepted as being an article of faith of Muslims. However the story raises some important issues, which are discussed later on.

Consider the following as given in Bukhari.

Hadis (Tradition)

Ref; Bukhari_- EnglishVol.5-No-427 Dr. Muhammad Mohsin Khan-Islamic University al-Madina al-Munnawwara-"*Narrated Jabir: We were digging (the trench) on the day of (al Khandaq i.e. Trench) and we came across a big rock. We went to the Prophet and said 'here is a rock appearing across the trench.' He said, 'I am coming down' Then he got up,* ***and a stone was tied to his belly for we had not eaten any thing for three days.*** *So the prophet took the spade and struck the big solid rock and it became like sand ....."*. This story is a long one and raises quite a few common sense type questions; but for the purposes of the topic under discussion we will dwell on the bold italics and ask, for the benefit of those who use *logic.*

a) When one is so desperately hungry, does it not make it even more traumatic to carry that extra dead weight around tied to ones belly?

b) When one is so desperately hungry, is it not common sense to believe that one grows weak? Therefore to smash the stone to sand, which the other companions collectively could not do (*that is why they called upon him for help*), is not only illogical but a pure fantasy? (Reminds one of Samson of 'Samson and Delilah')

c) When one is so desperately hungry and poor, isn't it illogical that he should had taken so many destitute widows and war captive under his wings for protection and sanctuary of marriage, as history tells us he did?

d) In the rest of the story, Muhammad took all the trench diggers at Jabir's house where only he and *one or two others* were invited in the first place. Wasn't it *unethical* for a Rasul to take so many uninvited guests with him?

e) *He was miraculously able to feed them all to the brim and then some was left over for the host*! If he could perform such miracles, then why could he not have fed himself and his household always? Is there an element of the syndrome of 'what other prophets could do our prophet could do even better'!

In relation to the story therefore, the above denies logic**.**

Historical

1. Muhammad was a member of the most influential and rich tribe of Quresh of Mecca and some of its influential members were his ardent supporters and protectors.
2. His first wife (Khadija) was one of the richest women in Mecca who implicitly believed in him and supported him in every way till her death.

3. Abu Bakar (later the first Khalif) was one of the richest men in Mecca and devoted himself and his wealth for the mission of the Rasul, from the very start.
4. Usman, Umar, Ali and many other influential, **rich** and **learned** people were his companion and ardent supporters in every way.
5. There were many young and old, men and women, ordinary and simple folks who were with him all the way. (Abu Huraira is said to be virtually fed daily by Muhammad)
6. The Ansaars of Madina, *where the trench was being dug* (Hijra 5), had not only pledged their support and protection to him but also shared their possessions with the Meccan-refugees (59-8,9). They were the ones in fact who invited him among themselves.

The Tradition therefore belies history. In the words of Iqbal;

Tilsm-e- bekhabari, kafari wa deendari

Hadis-e- Sheikh wa Barhaman fasoon wa afsanah

(Talisman of ignorance, denial and religious piety, stories of Sheikh and Brahmin are just sorcery and fiction)

The Quran

The Quran repeatedly stresses that Muhammad was ***a human being*** like the rest of us, but he was a recipient of Wahi 18-110(Revelation) and performed no unnatural impossible miracles. Therefore, ***the sacrifices and support of the early companions*** need to be acknowledged in order to give credit where it is due, to do justice to their memory and put the record straight. Now let us briefly consider Quran.

1 Surah Duha-93 " *…your **sustainer** (Rab) has not forsaken you for HE is not displeased with you…made you self sufficient….* And gave you all other spiritual and moral support"

2 Surah Inshirah-94 "… *your back was bent* and WE removed *every burden and raised you high in esteem…"*

3 Surah Kauthar-108 "*To you WE have granted the font of plenty…."*

There are many references in Quran to Muhammad's life and his mission. Allah instructed him, repeatedly encouraged him and confirmed HIS support for him. Quran is the actual biography of Muhammad Rasullullaah to refer to. (The Urdu readers should refer to *Miraj e Insaniyat* by G A Pervez-a biography from the Quran). Quran presents the Rasul in his true human context, as a fully focussed person to his mission and a great achiever. Quran itself acknowledges the contribution of his companions.

The Tradition therefore contradicts Quran.

The issues-

1 **Divisions**--The rancour and divisions the traditional corpus has generated among the Muslim community, is dragging the ill informed believers into **opposite camps**.

2 **Debt of Gratitude** --To deny the gratitude owed to the Rasool's benefactors**,** particularly the Ansaars, by the later day Muslims, that is us, is gross injustice; **ingratitude** and a corruption of character, which is what this Tradition projects. *Is there a reward for Good other than good**,*** 55-60***?*** Asks Quran.

3 **Immorality**--It is not only **immoral** but a mischief on the part of the perpetrators of the above tradition, if the simple folks were to be mislead in the context of Quran and History. The sacrifices would not only be obliterated from the early historic chapter of Muhammad's mission, but would render the so called believers who, day and night send ***"blessings***" on the Rasul and his ***companions*** as a part of their 'worship', as ungrateful hippocrates.

4 **Discredit**--The falsehood, in fact **demeans** Muhammad's human achievements, as he was a man of extraordinary leadership talents and strategy who, with the help of chosen supporters accomplished what under normal circumstances would be considered impossible!

The contribution of the companions who gave so much to the early struggle, physically and financially to make his mission a success is **discredited**. That makes it akin to "biting the hands" that nurtured Mohammad's mission. In a pragmatic context the success of the Deen was the true miracle (that is the manifestation of Allah's laws harmonised with by Muhammad and his companions.) Thus the above Hadis can only be classified as **falsehood**, **illogical** and an immoral tiding.

Belief in Quran is ***the only article of faith*** for a Muslim 28-85, and it repeatedly instructs us to use ***reason and intellect*** to distinguish one from the other.

The above is just one example from the Religious-Traditions to illustrate that it is necessary to distinguish between the sacred and the profane by the application of reason. The **educated** modern youth wants to question the 'blind faith syndrome' and wants to follow the trend of the enquiring intellectual mind, but it is acutely conscious of the many religious restraints and fears the Fatwaa, an effective antique tool to muzzle them. A climate of legitimate free thought must be cultivated if they are to be wooed back to Quran and its teachings.

****

B A S A N T

By
Ms. Shamim Anwar

==========

Mrs. Shireen Mazhar (February 11) and Mr. Samir Amin Shiwani (February 15) in DAWN have called for a ban on Basant. They have projected the view that Basant is a non-Muslim festival, both culturally and religiously. In other words we have adopted Hindu values and culture. There have been other letters as well wondering whether culture can be universal or is it exclusively regional.

Talking about festivals like Basant, I think that it is all a part of a joy of life. No matter where and how it is celebrated, we are all a part of one human family. Certain factors like geography, past history, climate and resources available may have an impact on the peculiarities of cultural activities, and adopting certain characteristics from another region does not make it un-Islamic, or Hindu, Christian etc. etc. In fact it is a good thing that it can bring people closer in an atmosphere of hatred and violence. As long as anything is not indecent and undignified and against Islamic human values, change and creativity makes life process dynamic and living, rather than static and deathly.

I hope readers will give some thought to this. However, the main factor that I intended to point out is that as far as Basant is concerned it is not a Hindu festival as it is generally believed. The Hindu festival is “Holi”, wherein they throw and sprinkle colored water on each other. Spring, as we all understand represents color with its blooming flowers and sunny weather after a dull and colorless winter. “Basant” festivity was the creation of Mir Khusrau during the Delhi Sultanate. February is the time when yellow flowers bloom in the fields making it the symbol of Spring. Wearing yellow clothes, flying yellow kites was not the only creation of Mir Khusrau. He also created the Basant Rag which was sung and played on instruments, while they joyfully moved towards the yellow fields flying kites. In fact Mir Khusrau was an all round genius, inventing the ‘tabla’, the ‘sittar’ and the ‘quawwali’ made of singing.

So Basant goes back to Mir Khusrau. Also we should not hesitate to adopt anything that is beautiful and dignified, and helps the world to come closer and closer. We are one human family, which is a Quranic concept, and we should move towards it in every possible way, while remaining within Quranic values.

==========